# ہم اُس کے ہیں

امجد اسلام امجد




# غزلیں

## سحر آثار

## بارش کی آواز



## اتنے خواب کہاں رکھوں گا

## اُس پار



## ذرا پھر سے کہنا

فشار



ساتواں در

---

# غزلیں

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصر
یہ قافیہ پیمائی، ذرا کر کے تو دیکھو

اسی بات کو اگلے وقتوں میں قبلہ میر تقی میر نے کچھ یوں بیان کیا تھا کہ

مصرعہ کبھو کبھو کوئی موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

اور کم و بیش اسی کیفیت کو غالب نے اپنی فطری جودتِ طبع کے باعث ایک نیا رنگ کچھ اس طرح سے دیا کہ "ظرفِ تنگنائے غزل" اُس سیلِ بلا کو سمیٹنے سے عاجز ہے جو اُس کی فکر اور ذہن میں ہمہ وقت کروٹیں لیتا رہتا ہے سو

کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

لیکن ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ امر اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ جہاں غزل کے امکانات اور اس کی سحر کاری اور جادو آفرینی کہکشاں در کہکشاں

پھیلتی چلی جا رہی ہے وہاں ہر دور میں غزل کہنے والوں نے ایسے ایسے رنگ اور پیرائے باندھے اور ایجاد کیے ہیں کہ غزل ہر امتحان سے نہ صرف کامیاب نکلی ہے بلکہ اس کے حُسن کی نئی سے نئی جہات بھی سامنے آتی رہتی ہیں۔

غزل کی اس قدر مضبوط کلاسیکی روایت اور موجودہ تخلیقی عمل اور امکانات سے پُر صورت حال میں کسی بھی غزل گو شاعر کے لیے ایسا نام حاصل کرنا جو ایک حوالہ بن جائے جُوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ میں اپنے آپ کو اس میدان کی پہلی صف کا آدمی نہیں سمجھتا کہ غزل گو شاعروں کی پہلی صف میں داخل ہونے کے لیے جس غیر معمولی صلاحیت کی ضرورت ہے وہ مجھے اپنی غزل میں نظر نہیں آتی۔ ناصر کاظمی مرحوم کہا کرتے تھے کہ جب وہ کوئی غزل کہہ لیتے ہیں تو تصوّر میں میر و غالب کو سامنے بٹھا کر اُن کو سُناتے ہیں اور پھر اُن کے اشارۂ چشم و ابرو یا داد کے کلمات کی روشنی میں اُس غزل کا مقام متعین کرتے ہیں۔ جب ناصر جیسے عمدہ اور باکمال شاعر کا یہ حال تھا تو ہم جیسے لوگوں کو تو کوئی دعویٰ کرتے وقت دس بار سوچنا چاہیے (یہ اور بات ہے کہ بہت سے احباب اپنے مقام کے تعیّن میں خود میر و غالب کو بھی کہیں میلوں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں) جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ اُردو غزل کے اکابرین کے ساتھ ساتھ اپنے سینئر ہم عصروں اور اپنے سے بعد لکھنا شروع کرنے والوں سے بھی اس شعبدہ ساز صنعت کے نت نئے اسرار و رموز اور پیرایوں کو سیکھنے کی کوشش کروں تاکہ جو باتیں میں بزبانِ غزل کہنا اور کرنا چاہتا ہوں اُن کا رشتہ اس کی عظیم اور زندہ روایت سے قائم اور جُڑا رہے۔

مجھے خوشی ہے کہ نظموں کے ساتھ ساتھ میری غزلوں کے قارئین کا بھی ایک خاصا بڑا حلقہ قائم ہو گیا ہے۔ میرے لیے اِتنی ہی پذیرائی بہت ہے کہ بڑے لوگوں کے گروپ فوٹو میں جگہ مِل جانا بھی اپنی جگہ پر ایک عزّت اور افتخار کی بات ہوتی ہے۔

امجد اسلام امجد



حد سے توقعات زیادہ کیے ہُوئے
بیٹھے ہیں دل میں ایک ارادہ کیے ہُوئے

اِس دشتِ بے وفائی میں جائیں کہاں کہ ہم
ہیں اپنے آپ سے کوئی وعدہ کیے ہُوئے

دیکھو تو کتنے چین سے ! کس درجہ مُطمئن !
بیٹھے ہیں ارضِ پاک کو آدھا کیے ہُوئے

## ق

پاؤں سے خواب باندھ کے شامِ وصال کے
اِک دشتِ انتظار کو جادہ کیے ہُوئے!

آنکھوں میں لے کے جلتے ہُوئے موسموں کی راکھ!
گردِ سفر کو تن کا لبادہ کیے ہُوئے

دیکھو تو کون لوگ ہیں! آئے کہاں سے ہیں!
اور اب ہیں کس سفر کا اِرادہ کیے ہُوئے؟

---

اُس سادہ رُو کے بزم میں آتے ہی بُجھ گئے
جتنے تھے اہتمام زیادہ کیے ہُوئے

ہم اُٹھے ہیں اُس کی بزم سے امجد ہزار بار
ہم ترکِ آرزو کا اِرادہ کیے ہُوئے!



دَر و دیوار ہیں، مکان نہیں
واقعہ ہے، یہ داستان نہیں

وقت کرتا ہے ہر سوال کو حل
زیست مکتب ہے امتحان نہیں

ہر قدم پر ہے اِک نئی منزل
راستوں کا کہیں نشان نہیں

رنگ بھی زندگی کے مظہر ہیں
صرف آنسو ہی ترجمان نہیں

دل سے نکلی ہوئی صدا کے لیے
کچھ بہت دور آسماں نہیں

کل کو ممکن ہے اک حقیقت ہو
آج جس بات کا گماں نہیں

شور کرتے ہیں ٹوٹتے رشتے
ہم کو گھر چاہیئے مکاں نہیں

خواب، ماضی؛ سراب، مستقبل!
اور جو "ہے" وہ میری جاں "نہیں"

اتنے تارے تھے رات، لگتا تھا
کوئی میلہ ہے آسماں نہیں

شاخِ سدرہ کو چھو کے لوٹ آیا
اس سے آگے مری اڑاں نہیں

یوں جو بیٹھے ہو بے تعلّق سے
کیا سمجھتے مری زباں نہیں؟

کوئی دیکھے تو موت سے بہتر
زیست کا کوئی پاسباں نہیں

اک طرف میں ہوں اک طرف تم ہو
سلسلہ کوئی درمیاں نہیں

---

کوئی بھی لمحہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا
وہ شخص ایسا گیا پھر نظر نہیں آیا

وفا کے دشت میں رستہ نہیں ملا کوئی
سوائے گردِ سفر، ہم سفر نہیں آیا

پلٹ کے آنے لگے شام کے پرندے بھی
ہمارا صبح کا بھولا مگر نہیں آیا

کسی چراغ نے پوچھی نہیں خبر میری
کوئی بھی پھول مرے نام پر نہیں آیا

چلو کہ کوچۂ قاتل سے ہم ہی ہو آئیں
کہ نخلِ دار پہ کب سے ثمر نہیں آیا!

خدا کے خوف سے جو دل لرزتے رہتے ہیں
اُنھیں کبھی بھی زمانے سے ڈر نہیں آیا

کدھر کو جاتے ہیں رستے، یہ راز کیسے کھُلے
جہاں میں کوئی بھی بارِ دگر نہیں آیا

یہ کیسی بات کہی شام کے ستارے نے
کہ چین دل کو مرے رات بھر نہیں آیا

ہمیں یقین ہے امجد نہیں وہ وعدہ خلاف
پہ عمر کیسے کٹے گی، اگر نہیں آیا!

ہم تو اسیرِ خواب تھے تعبیر جو بھی تھی
دیوار پر لکھی ہُوئی تحریر جو بھی تھی

ہر فرد لاجواب تھا، ہر نقش بے مثال
مِل جُل کے اپنی قوم کی تصویر جو بھی تھی!

جو سامنے ہے، سب ہے یہ، اپنے کیے کا پھل
تقدیر کی تو چھوڑیئے، تقدیر جو بھی تھی

آیا اور اِک نگاہ میں برباد کر گیا
ہم اہلِ انتظار کی جاگیر جو بھی تھی

قدریں جو اپنا مان تھیں، نیلام ہوگئیں
ملبے کے مول بِک گئی تعمیر جو بھی تھی

طالب ہیں تیرے رحم کے، ہم عُدل کے نہیں
جیسا بھی اپنا جُرم تھا، تقصیر جو بھی تھی

ہاتھوں پہ کوئی زخم نہ پیروں پہ کچھ نشاں
سوچوں میں تھی پڑی ہُوئی، زنجیر جو بھی تھی

یہ اور بات چشم نہ ہو معنی آشنا
عبرت کا ایک درس تھی، تحریر جو بھی تھی

امجد ہماری بات وہ سُنتا تو ایک بار
آنکھوں سے اُس کو چُومتے، تعزیر جو بھی تھی

---

○

منظر کے اِرد گرد بھی اور آر پار دُھند
آئی کہاں سے آنکھ میں یہ بے شمار دُھند!

کیسے نہ اُس کا سارا سفر رائیگاں رہے
جس کاروانِ شوق کی ہے رہگزار دُھند!

ہے یہ جو ماہ و سال کا میلہ لگا ہُوا
کرتی ہے اِس میں چُھپ کے مِرا انتظار دُھند

آنکھیں وہ بزم، جس کا نشاں ڈولتے چراغ
دل وہ چمن، کہ جس کا ہے رنگِ بہار دُھند



کمرے میں میرے غم کے سِوا اور کچھ نہیں
کھڑکی سے جھانکتی ہے کسے بار بار دُھند

فردوسِ گوش ٹھہرا ہے مبہم سا کوئی شور
نظارگی کا شہر میں ہے اعتبار، دُھند

ناٹک میں جیسے بکھرے ہوں کردار جا بجا
امجد فضائے جاں میں ہے یوں بے قرار دُھند!

---

اُداسی میں گھرا تھا دِل چراغِ شام سے پہلے
نہیں تھا کچھ سرِ محفل چراغِ شام سے پہلے

حُدی خوانو، بڑھاؤ لَے، اندھیرا ہونے والا ہے
پہنچنا ہے سرِ منزل چراغِ شام سے پہلے

دِلوں میں اور ستاروں میں اچانک جاگ اُٹھتی ہے
عجب ہلچل، عجب جھل مِل چراغِ شام سے پہلے

وہ ویسے ہی وہاں رکھی ہے، عصرِ آخرِ شب میں
جو سینے پر دھری تھی سِل، چراغِ شام سے پہلے

ہم اپنی عُمر کی ڈھلتی ہُوئی اِک سہ پہر میں ہیں
جو مِلنا ہے ہمیں تو مِل، چراغِ شام سے پہلے

ہمیں اے دوستو اب کشتیوں میں رات کرنی ہے
کہ چُھپ جاتے ہیں سب ساحل، چراغِ شام سے پہلے

سَحر کا اوّلیں تارا ہے جیسے رات کا ماضی
ہے دن کا بھی تو مُستقبل، چراغِ شام سے پہلے

نجانے زندگی اور رات میں کیسا تعلّق ہے!
اُلجھتی کیوں ہے اِتنی گِل چراغِ شام سے پہلے

محبّت نے رگوں میں کس طرح کی روشنی بھر دی!
کہ جل اُٹھتا ہے امجد دِل، چراغِ شام سے پہلے

---

آنکھوں کا رنگ ، بات کا لہجہ بدل گیا
وہ شخص ایک شام میں کتنا بدل گیا !

کچھ دن تو میرا عکس رہا آئینے پہ نقش
پھر یوں ہُوا کہ خُود مرا چہرا بدل گیا

جب اپنے اپنے حال پہ ہم تم نہ رہ سکے
تو کیا ہوا جو ہم سے زمانہ بدل گیا

قدموں تلے جو ریت بچھی تھی وہ چل پڑی
اُس نے چھڑایا ہاتھ تو صحرا بدل گیا

کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر نہیں رہی
جاتے ہی ایک شخص کے کیا کیا بدل گیا!

اِک سرخوشی کی موج نے کیسا کیا کمال!
وہ بے نیاز، سارے کا سارا بدل گیا

اُٹھ کر چلا گیا کوئی وقفے کے درمیاں
پردہ اُٹھا تو سارا تماشا بدل گیا

حیرت سے سارے لفظ اُسے دیکھتے رہے
باتوں میں اپنی بات کو کیسا بدل گیا

کہنے کو ایک صحن میں دیوار ہی بنی
گھر کی فضا ، مکان کا نقشہ بدل گیا

شاید وفا کے کھیل سے اُکتا گیا تھا وہ
منزل کے پاس آکے جو رستہ بدل گیا

قائم کسی بھی حال پہ دُنیا نہیں رہی
تعبیر کھو گئی، کبھی سپنا بدل گیا

منظر کا رنگ اصل میں سایا تھا رنگ کا
جس نے اُسے جدھر سے بھی دیکھا بدل گیا

اندر کے موسموں کی خبر اُس کو ہو گئی!
اُس نو بہارِ ناز کا چہرا بدل گیا

آنکھوں میں جتنے اشک تھے جگنو سے بن گئے
وہ مُسکرایا اور مری دُنیا بدل گیا

اپنی گلی میں اپنا ہی گھر ڈھونڈتے ہیں لوگ
امجد یہ کون شہر کا نقشہ بدل گیا

---

آنکھوں کو التباس بہت دیکھنے میں تھے
کل شب عجیب عکس مرے آئنے میں تھے

سارے دھنک کے رنگ تھے اُس کے لباس میں
خُوشبو کے سارے انگ اُسے سوچنے میں تھے

ہر بات جانتے ہُوئے دِل مانتا نہ تھا
ہم جانے اعتبار کے کِس مرحلے میں تھے

وصل و فراق دونوں ہیں اِک جیسے ناگزیر
کچھ لطف اُس کے قرب میں، کچھ فاصلے میں تھے

سیلِ زماں کی موج کا ہر وار سہہ گئے
وہ دن، جو ایک ٹوٹے ہُوئے رابطے میں تھے!

غارت گری کے بعد بھی روشن تھیں بستیاں
ہارے ہُوئے تھے لوگ مگر حوصلے میں تھے!

ہر پھر کے آئے نقطۂ آغاز کی طرف
جتنے سفر تھے اپنے کسی دائرے میں تھے

آندھی اُڑا کے لے گئی جس کو ابھی ابھی
منزل کے سب نشان اُسی راستے میں تھے

چھُولیں اُسے کہ دُور سے بس دیکھتے رہیں!
تارے بھی رات میری طرح، مخمصے میں تھے

جگنو، ستارے، آنکھ، صبا، تتلیاں، چراغ
سب اپنے اپنے غم کے کسی سلسلے میں تھے!

جتنے تھے خط تمام کا تھا ایک زاویہ
پھر بھی عجیب پیچ مرے مسئلے میں تھے

امجد کتابِ جاں کو وہ پڑھتا بھی کس طرح!
لکھنے تھے جتنے لفظ، ابھی حافظے میں تھے

---

اُس بے وفا سے ہم کو یہ نسبت بھی کم نہیں
کچھ وقت ہم نے ساتھ گزارا ہُوا تو ہے

اپنی طرف اُٹھے نہ اُٹھے اُس کی چشمِ خوش!
امجدؔ کسی کے دَرد کا چارا ہُوا تو ہے!

---



ظاہر شمال میں کوئی تارا ہُوا تو ہے
اِذنِ سفر کا ایک اِشارا ہُوا تو ہے

کیا ہے! جو رکھ دیں آخری داؤ میں نقدِ جاں!
ویسے بھی ہم نے کھیل یہ ہارا ہُوا تو ہے

وہ جانے، اُس کو خیر خبر ہے بھی یا نہیں!
دل ہم نے اس کے نام پہ وارا ہُوا ہے

پاؤں میں نارسائی کا اِک آبلہ سہی
اِس دشتِ غم میں کوئی ہمارا ہُوا تو ہے



اُلجھن تمام عُمر یہ تارِ نفس میں تھی!
دِل کی مُراد عاشقی میں یا ہوس میں تھی!

دَر تھا کھُلا، پہ بیٹھے رہے پَر سمیٹ کر
کرتے بھی کیا کہ جائے اماں ہی قفس میں تھی!

سکتے میں سب چراغ تھے تارے تھے دم بخُود!
مَیں اُس کے اختیار میں، وہ میرے بس میں تھی

اَب کے بھی ہے جمی ہُوئی، آنکھوں کے سامنے
خوابوں کی ایک دُھند جو پچھلے برس میں تھی

کل شب تو اُس کی بزم میں ایسے لگا مجھے!
جیسے کہ کائنات مری دسترس میں تھی

محفل میں آسمان کی بولے کہ چُپ رہے
امجد سدا زمین اسی پیش و پس میں تھی

---



سب کی اِک اوقات — "عشق نہ پُوچھے ذات"
بالکل بھُول گئے — کرنی تھی کیا بات

سستا کر دے گی — زر کی یہ افراط!
اَب سے تیرے ہیں — میرے دن اور رات

سچّے جذبوں سے — مہنگی ہو گئی دھات
اب کے خُوب ہوئی — بِن موسم برسات

کٹ ہی جاتی ہے — کیسی بھی ہو رات!
باسی ہوتی جائے — دل میں رکھّی بات

کچّی ڈور، میاں! — کب تک دیتی ساتھ!
گرہیں کھولے گا — جانے کب وہ ہاتھ!

تجھ کو چاہوں مَیں — کیا میری اوقات!
کیسے اُجڑ گئے؟ — خوابوں کے باغات

(ق)

وقت سمندر میں — ایک سے ہیں دن رات
آگے گہری کھائی — پیچھے ہے ظُلمات!

---

غم کے دھاگوں سے — امجد خوشیاں کات!

---



زمین جلتی ہے اور آسمان ٹُوٹتا ہے،
مگر گریز کریں ہم تو مان ٹُوٹتا ہے!!

کوئی بھی کام ہو انجام تک نہیں جاتا!
کسی کے دھیان میں پَل پَل یہ دھیان ٹُوٹتا ہے

کہ جیسے مَتن میں ہر لفظ کی ہے اپنی جگہ
جو ایک فرد کٹے، کاروان ٹوٹتا ہے

نژادِ صبح کے لشکر کی آمد آمد ہے
حصارِ حلقۂ شب زادگان ٹوٹتا ہے

اگر یہی ہے عدالت! اور آپ ہیں مُنصف!
عجب نہیں جو ہمارا بیان ٹوٹتا ہے

وفا کے شہر کے رستے عجیب ہیں امجد
ہر ایک موڑ پہ اِک مہربان ٹوٹتا ہے

---

کہتا ہے درپن     میرے جیسا بن!
تاریکی کی موت!     ایک نحیف کرن
محنت اپنا مال     وقت، پرایا دھن
بات نہ کرنے سے     بڑھتی ہے اُلجھن
اپنے دِل جیسا!     کوئی نہیں دشمن
دُنیا۔ لَوٹا دے     میرا اپنا پن
جھوٹے جی اُٹھے     جاگ پڑے جامن
روز وہی قصّہ!     روز وہی اُلجھن!
صدیاں لُوٹ گئی     پائل کی چھَن چھَن
یہ تو برسے گا     ساون ہے، ساون!

سارے خاک سمان     تن اور مَن اور دھن
اپنوں ہی سے تو     ہوتی ہے اَن بَن
سب سے اچھا ہے     اپنا گھر آنگن!
پیاس بڑی ہے یا     سونے کا برتن؟
کیا اُفتاد پڑی!     لگتا ناہیں مَن
آدم زاد نہیں،     بستی ہے یا بَن!
کیسا بھی ہو رُوپ!     مٹی ہے مدفن
سکّے کے دو رُخ     برہن اور دُلہن
دھوکہ دیتے ہیں     اُجلے پیراہن
راہ میں کھلتا پھول     بیوہ کا جوبن
دونوں جھوٹے ہیں     ساجن اور ساون
آہٹ کس کی ہے     تیز ہُوئی دھڑکن
اُتنی خواہش کر     جتنا ہے دامن
ہم تم دونوں ہیں     دھرتی اور ساون
عکس بنے کیسے؟     دُھندلا ہے درپن

زیرِ آب ہُوئے خوابوں کے مسکن
ٹھہر گیا ہے کیوں! آنکھوں میں ساون!

(ق)

کچّا سونا ہی بنتا ہے کُندن
اِک دِن نِکھرے گا سچّا ہے گر، فن!
کیسے روک سکے! خُوشبو کو گلشن
امجد میرے ساتھ
اَب تک ہے بچپن!

---

کسی ترنگ، کسی سرخوشی میں رہتا تھا
یہ کل کی بات ہے، دل زندگی میں رہتا تھا

کہ جیسے چاند کے چہرے پہ آفتاب کی لَو
کھُلا کہ میں بھی کسی روشنی میں رہتا تھا

سرشتِ آدمِ خاکی، ذرا نہیں بدلی!
فلک پہ پہنچا مگر، غار ہی میں رہتا تھا

کہا یہ کس نے کہ رہتا تھا میں زمانے میں
ہجومِ دردِ غمِ بے کسی میں رہتا تھا

ق

کلام کرتا تھا قوسِ قزح کے رنگوں میں
وہ اِک خیال تھا اور شاعری میں رہتا تھا

گلُوں پہ ڈولتا پھرتا تھا اوس کی صُورت!
صدا کی لہر تھا اور نغمگی میں رہتا تھا

نہیں تھی حُسنِ نظر کی بھی کچُھ اُسے پروا
وہ ایک ایسی عجب دلکشی میں رہتا تھا

وہاں پہ اب بھی ستارے طواف کرتے ہیں
وہ جس مکان میں، جس بھی گلی میں رہتا تھا

بس ایک شام بڑی خامشی سے ٹوٹ گیا
ہمیں جو مان، تری دوستی میں رہتا تھا

کِھلا جو پھُول تو برباد ہو گیا امجد
طلسمِ رنگ مگر غنچگی میں رہتا تھا

---

سب دیکھتے تھے اور کوئی سوچتا نہ تھا
جیسے یہ کوئی کھیل تھا، اِک واقعہ نہ تھا!

لکھتے بیاضِ وقت پہ ہم کیا تاثرات
سب کچھ تھا درج اور کوئی حاشیہ نہ تھا

آپس کی ایک بات تھی، دونوں کے درمیاں
اے اہلِ شہر آپ کا یہ مسئلہ نہ تھا!

تیری گلی میں آئے تھے بس تجھ کو دیکھنے!
اِس کے سِوا ہمارا کوئی مدّعا نہ تھا

تھے ثبت حکمِ ہجر پہ اُس کے بھی دستخط
تقدیر ہی کا لکھا ہُوا فیصلہ نہ تھا

اِک سمت پاسِ عشق تھا، اِک سمت اپنا مان
کیسے گُریز کرتے! کوئی راستہ نہ تھا!!

امجد یہ اقتدار کا حلقہ عجیب ہے
چاروں طرف تھے عکس کوئی آئنہ نہ تھا

---

○

جب تک رستے جائیں　　یوں ہی چلتے جائیں
آئینوں سے کیوں ؟　　عکس مُکرتے جائیں!
آنکھیں ہیں آباد !　　خواب اُجڑتے جائیں
ایسی آندھی میں !　　خاک سنورتے جائیں!!
اپنی سوچوں سے　　آپ ہی ڈرتے جائیں
عکس کریں تو کیا　　نقش بگڑتے جائیں
جلتی آنکھوں میں　　سپنے بُجھتے جائیں
جتنا دُھتکارے　　اور پلٹتے جائیں
رو لیں خُود پر ہی　　کچُھ تو کرتے جائیں!



ق

بیٹھے بیٹھے ہی　　ہاتھ نہ ملتے جائیں
ایک چراغ سہی　　راہ میں دُھرتے جائیں
سچّی بات لکھیں　　جب تک لکھتے جائیں
جو کچھ بس میں ہے　　وہ تو کرتے جائیں
رزمِ ہستی سے　　لڑتے لڑتے جائیں
مُردہ مٹّی کو　　زندہ کرتے جائیں
جب تک زندہ ہیں　　آگے بڑھتے جائیں

ق

آؤ ہم اور تُم　　ایسا کرتے جائیں
آنکھوں آنکھوں میں　　باتیں کرتے جائیں
باتوں باتوں میں　　غنچے کھلتے جائیں

رنگوں میں نکلیں    خوشبو ہوتے جائیں
اُمّیدیں پھوٹیں    خدشے مرتے جائیں
امجد سب کے دل
اور نکھرتے جائیں



گزرے کل سا لگتا ہو جب آنے والا کل
ایسے حال میں رہنے سے تو بہتر ہے کہ چل

کرتی ہیں ہر شام یہ بنتی، آنکھیں ریت بھری
روشن ہوں اے امن کے تارے، ظلم کے سورج، ڈھل

اپنا مطلب کھو دیتی ہے دل میں رکھی بات
رونا ہے تو کھل کے رو اور جلنا ہے تو، جل

لمحوں کی پہچان یہی ہے، اُڑتے جاتے ہیں
آنکھوں کی دہلیز پہ کیسے ٹھہر گیا، وہ پل!

عشق کے رستے لگ جائیں تو لوگ بھلے چنگے
ہوتے ہوتے ہو جاتے ہیں، دیوانے، پاگل!

موسم کی سازش ہے یا پھر مٹی بانجھ ہوئی!
پیڑ زیادہ ہوتے جائیں، گھٹتا جائے پھل!

جُھکی جُھکی آنکھوں کے اُوپر بوجھل پلکیں تھیں
لیکن کیسے چُھپ سکتا تھا! کاجل ہے کاجل!

زور آور کے دستِ ستم میں دونوں گروی ہیں
مزدوروں کا خُون پسینہ، دہقانوں کا ہل!

بُجھتے تاروں کی جھلمل میں اوس لرزتی ہے
امجد دُنیا جاگ رہی ہے تو بھی آنکھیں مل



خُود اپنے لیے بیٹھ کے سوچیں گے کسی دن
یُوں ہے کہ تجھے بُھول کے دیکھیں گے کسی دن

بھٹکے ہُوئے پھرتے ہیں کئی لفظ جو دل میں
دُنیا نے دیا وقت تو لکھیں گے کسی دن

ہل جائیں گے اِک بار تو عرشوں کے دَر و بام
یہ خاک نشیں لوگ جو بولیں گے کسی دن

آپس کی کسی بات کا ملتا ہی نہیں وقت
ہر بار یہ کہتے ہیں کہ "بیٹھیں گے کسی دن"!

اے جان تری یاد کے بے نام پرندے
شاخوں پہ مرے درد کی اُتریں گے کسی دن؟

جاتی ہے کسی جھیل کی گہرائی کہاں تک!
آنکھوں میں تری ڈوب کے دیکھیں گے کسی دن

خُوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے
اِک نظم ترے واسطے لکھیں گے کسی دن

سوئیں گے تری آنکھ کی خلوت میں کسی رات
سائے میں تری زُلف کے جاگیں گے کسی دن!

صحرائے خرابی کی اسی گردِ سفر سے
پھُولوں سے بھرے راستے نکلیں گے کسی دن

خُوشبو کی طرح، مثلِ صبا، خواب نما سے
گلیوں سے ترے شہر کی گزُریں گے کسی دن

امجد ہے یہی اب کہ کفن باندھ کے سر پر
اُس شہرِ ستم گار میں جائیں گے کسی دن!

---

موجود تو ہوں گے مگر احساس کی صُورت!
خُوشبو کی طرح رنگ کے میلے میں رہیں گے

آنکھوں میں اُتر آئے گی اَندر کی اُداسی
امجد جو یونہی آپ اکیلے میں رہیں گے!



خواہش کی کسی موج کے ریلے میں رہیں گے
شبنم کی طرح، صُبح کے میلے میں رہیں گے!

دیکھے گی زمیں، روز نیا ایک تماشا
جب تک ہے فلک، لوگ، جھمیلے میں رہیں گے

مرجائیں گے ہم تم تو، مگر گیت ہمارے
اے دوست رواں، وقت کے بیلے میں رہیں گے

○

دردِ دل کا جہاں رواج نہیں
ایک انبوہ ہے، سماج نہیں

اے غمِ ہجرِ یار، یہ تو بتا
کیا تجھے کوئی کام کاج نہیں!

وہ ہے ہرجائی، یہ بجا، لیکن
دل بھی تو مستقل مزاج نہیں



تیرے غم کے سوا زمانے میں
کون سے درد کا علاج نہیں!

حرص کھا جاتی ہے غریب کا رزق
ورنہ کچھ کم تو یاں اناج نہیں

تیری آنکھوں سی، دوسری آنکھیں
شاید ہوں گی کبھی، پر آج، نہیں

مملکت حسن سی نہیں کوئی
عشق سا کوئی تخت و تاج نہیں

ق

کون سی آنکھ ہے تہی تجھ سے!
کون سے دل پہ تیرا راج نہیں!

اے خُدا، اے مرے ہُنر کے خُدا
اور کچھ میری احتیاج نہیں!

بستیوں کو نہ پستیوں میں رکھ
التجا ہے یہ، احتجاج نہیں

---



رات کی سیج خالی خالی ہے
دیکھ، وہ صبح ہونے والی ہے!

میرے دل سے تری نگاہوں تک
درد نے راہ کیا نکالی ہے!

ہے پرے حدِّ آسماں سے کیا؟
سب فضا اپنی دیکھی بھالی ہے

کہہ رہی ہے چمک ستاروں کی
درد کی رات ڈھلنے والی ہے!

جو نہ کہنی تھی بات، کہہ آئے
اور جو کہنی تھی وہ چُھپالی ہے

اِک طرف دل تھا، اِک طرف دُنیا
ہم نے دونوں سے سُرملالی ہے

آنکھ والوں کے واسطے، منظر
ایک روزن ہے، ایک جالی ہے!

پھر وہی آنسوؤں کی بارش ہے
پھر وہی دل کی خشک سالی ہے!

پھیلتی جارہی ہے قوسِ قزح
دل پہ کس نے نگاہ ڈالی ہے

دوستوں کا وہ دوست ہے امجد
نام جس کا جمیلِ عالی ہے

افلاک کا سایا ہے جو کچھ بھی زمیں پر ہے
ہے خواب کہیں میرا، تعبیر کہیں پر ہے

کچھ ایسی نظر ڈالی ہنگامِ وداع اُس نے
میں خُود تو چلا آیا دل اب بھی وہیں پر ہے

اے فکرِ سماواتی، اے طائرِ لاہُوتی!
پرواز سے کیا حاصل! جو کچھ ہے زمیں پر ہے

"موجود" میں رہنے سے "آئندہ" نہیں ملتا
اثبات کا ہر جلوہ موقوف "نہیں" پر ہے

اُس لمحے کے جادُو سے پھر وقت نہیں نکلا
جو چیز جہاں پر تھی وہ چیز وہیں پر ہے

چاہے تو یونہی رکھے، چاہے تو سحر کر دے
اِس رات کا مُستقبل اُس ماہ جبیں پر ہے

اِس عمُر کی فرُصت میں ہر چیز کا ہونا ہے
جنّت بھی یہیں ہو گی! دوزخ جو یہیں پر ہے

—



کرتا ہُوں جمع میں تو بکھرتی ہے ذات اور
باقی ہے کتنی اے مرے مولا، یہ رات اور!

لیتی ہے جلتی شمع بھی بُجھنے میں کچُھ تو وقت
ہے آدمی سا کوئی کہاں بے ثبات اور!

سیلاب جیسے لیتا ہے دیوار کے قدم
کرتا ہے غم بھی دل سے کوئی واردات اور

یوں تو حضورِ پاکؐ کے لاکھوں ہیں مدح خواں
تائبؔ[1] سی لکھ رہا ہے مگر کون، نعت اور!

مظہر، اَزل کے حُسن کے امجدؔ ہیں بے شُمار
لیکن جو دیکھئے تو ہے بارش کی بات اور



شمارِ گردشِ لیل و نہار کرتے ہُوئے
گزُر چلی ہے ترا انتظار کرتے ہُوئے

خُدا گواہ ، وہ آسُودگی نہیں پائی
تمھارے بعد کسی سے بھی پیار کرتے ہوئے

اَزل سے یونہی چلی آرہی ہے یہ دُنیا
اِسے نہالؔ اُسے بے قرار کرتے ہُوئے

ا۔ حفیظ تائب

تمام اہلِ سفر ایک سے نہیں ہوتے
کھُلا یہ وقت کے دریا کو پار کرتے ہوئے

ق

عجب نہیں کبھی گزُرے ترے خیال کی رَو
مرے گمان کے طائر شکار کرتے ہُوئے

کہیں چھُپائے مرے سامنے کے سب منظر
مجھے، مجھی پہ کبھی آشکار کرتے ہُوئے

---

کِسے خبر ہے کہ اہلِ چمن پہ کیا گزری!
خزاں کی شام کو صبحِ بہار کرتے ہُوئے

ہَوس کی اور لُغت ہے وفا کی اور زباں
یہ راز ہم پہ کھُلا، انتظار کرتے ہُوئے

عجیب شے ہے محبّت کہ شاد رہتی ہے
تباہ ہوتے ہوئے اور غبار کرتے ہُوئے

ق

جو ہو سکے تو کبھی میر جی سے یہ پُوچھیں
یہ جان اُن کی غزل پر نثار کرتے ہُوئے

یہ کارخانہ اگر سرتاپا توہّم ہے؟
تو لوگ کیسے چلیں، اعتبار کرتے ہوئے

---

ہمارے بس میں کوئی فیصلہ تھا کب امجدؔ!
جُنوں کو چُنتے، وفا اختیار کرتے ہُوئے!



دو گھڑی دِل کا حال سُنتا جا
اے مِرے خُوش جمال سُنتا جا

عِشق کی خُود سُپردگی کو دیکھ!
عقل کی قیل و قال، سُنتا جا

یہ اَماوس کی آخری شب ہے
داستانِ ملال، سُنتا جا

”من نہ کردم، شما حذر بکنید“
زندگی کا مآل، سُنتا جا



تجھ سے کرنا نہیں جواب طلب
آخری اِک سوال سُنتا جا

گُونج میں ٹوٹتے ستاروں کی
سب عرُوج و زوال سُنتا جا

تجھ پہ بیتی ہے جو بھی کہہ امجد
کچھ مِرے حسبِ حال سُنتا جا

---



آئینوں میں عکس نہ ہوں تو حیرت رہتی ہے
جیسے خالی آنکھوں میں بھی وحشت رہتی ہے

ہر دم دُنیا کے ہنگامے گھیرے رکھتے تھے
جب سے تیرے دھیان لگے ہیں فرصت رہتی ہے

کرنی ہے تو کُھل کے کرو انکارِ وفا کی بات
بات ادھوری رہ جائے تو حسرت رہتی ہے

شہرِ سخن میں ایسا کچھ کر، عزت بن جائے
سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے عزت رہتی ہے



بنتے بنتے ڈھ جاتی ہے دل کی ہر تعمیر
خواہش کے بہروپ میں شاید قسمت رہتی ہے!

سائے لرزتے رہتے ہیں شہروں کی گلیوں میں
رہتے تھے انسان جہاں اب دہشت رہتی ہے

موسم کوئی خوشبو لے کر آتے جاتے ہیں
ہر پل دھیان دریچے میں اک صورت رہتی ہے

چاپ کوئی جو مُڑ جاتی ہے دل دروازے سے
کیا کیا ہم کو رات گئے تک وحشت رہتی ہے!

دھیان میں میلہ سا لگتا ہے بیتی یادوں کا
اکثر اُس کے غم سے دل کی صحبت رہتی ہے

پھولوں کی تختی پہ جیسے رنگوں کی تحریر
لوحِ سخن پر ایسے امجد شہرت رہتی ہے

○

جو بھی اُس چشمِ خُوش نگاہ میں ہے
حاکمِ وقت کی پناہ میں ہے

فرق سائل کی بے صدا میں کچھ!
یا کمی ظرفِ بادشاہ میں ہے؟

اُس کو اہلِ ہوس نہ سمجھیں گے!
لُطف جو فاصلے کی چاہ میں ہے



داستاں، شب کے جاگنے کی، رقم
آنکھ کے حلقۂ سیاہ میں ہے

حالتِ جنگ ہی میں رہتا ہے
جب سے دل دزد کی سپاہ میں ہے

نہیں وہ خواہشِ نجات میں بھی
جو کشش دامنِ گناہ میں ہے!

بے نیازی سہی طبیعت میں
دلبری بھی تو اُس نگاہ میں ہے

رُوح بیدار ہوتی جاتی ہے
دل کسی روشنی کی راہ میں ہے

تیغِ دو دم سے بھی سوا خطرہ
حلقۂ قربِ بادشاہ میں ہے

بہت آساں ہے مُدّعی ہونا!
جتنی مشکل ہے سب نباہ میں ہے

کیا یقیں ہو کسی پہ جب، امجد
اپنا ہونا بھی اشتباہ میں ہے!



دِل کو حصارِ رنج و اَلم سے نکال بھی
کب سے بکھر رہا ہوں مجھے اب سنبھال بھی

آہٹ سی اُس حسین کی ہر سُو تھی، وہ نہ تھا
ہم کو خُوشی کے ساتھ رہا اِک ملال بھی

سب اپنی اپنی موجِ فنا سے ہیں بے خبر
میرا کمالِ شاعری، تیرا جمال بھی

حُسنِ ازل کی جیسے نہیں دُوسری مثال
ویسا ہی بے نظیر ہے اُس کا خیال بھی!

مت پُوچھ کیسے مرحلے آنکھوں کو پیش تھے
تھا چودھویں کا چاند بھی، وہ خُوش جمال بھی!

جانے وہ دن تھے کون سے اور کون سا تھا وقت!
گڈمڈ سے اب تو ہونے لگے ماہ و سال بھی!

اِک چشمِ التفات کی پیہم تلاش میں
ہم بھی اُلجھتے جاتے ہیں، لمحوں کا جال بھی!

دُنیا کے غم ہی اپنے لیے کم نہ تھے کہ اور
دل نے لگا لیا ہے یہ تازہ وبال بھی!

اِک سرسری نگاہ تھی، اِک بے نیاز چُپ
میں بھی تھا اُس کے سامنے، میرا سوال بھی!

آتے دنوں کی آنکھ سے دیکھیں تو یہ کھُلے
سب کچھ فنا کا رزق ہے ماضی بھی حال بھی!

تم دیکھتے تو ایک تماشے سے کم نہ تھا
آشفتگانِ دشتِ محبّت کا حال بھی!

اُس کی نگاہِ لُطف نہیں ہے، تو کچھ نہیں
امجد یہ سب کمال بھی، صاحبِ کمال بھی!

---

○

جو دیکھنے کا تمھیں اہتمام کرتے ہیں
زمیں سے جھک کے ستارے کلام کرتے ہیں

تو آؤ آج سے ہم ایک کام کرتے ہیں
وفا کے نام سبھی صبح و شام کرتے ہیں

یہ راستہ ہے مگر ہجرتی پرندوں کا
یہاں سمے کے مسافر قیام کرتے ہیں

وفا کی قبر پہ کب تک اِسے جلا رکھیں
سو یہ چراغ ہواؤں کے نام کرتے ہیں

کبھی جو بام پہ ٹھہرے تو چاند رُک جائے
غزال دیکھ کے اُس کو خرام کرتے ہیں

(ق)

یہ اہلِ درد کی بستی ہے زرگروں کی نہیں
یہاں دِلوں کا بہت احترام کرتے ہیں

جہاں پناہوں کی جانب نظر نہیں کرتے
غریبِ شہر کو جُھک کر سلام کرتے ہیں

ہے اِن کی چشمِ توجہ میں روشنی ایسی
کہ جیسے اِس میں ستارے قیام کرتے ہیں

یہاں پہ سکۂ اہلِ ریا نہیں چلتا
کہ اہلِ درد نظر سے کلام کرتے ہیں

یہ حق پرست ہیں کیسے عجیب سوداگر
فنا کی آڑ میں کارِ دوام کرتے ہیں

جہاں جہاں پہ گرا ہے لہو شہیدوں کا
وہاں وہاں پہ فرشتے سلام کرتے ہیں

نہ گھر سے اِن کو ہے نسبت نہ کوئی نام سے کام
دِلوں میں بستے، نظر میں مقام کرتے ہیں

رواجِ اہلِ جہاں سے انھیں نہیں مطلب
کہ یہ تو رسمِ محبّت کو عام کرتے ہیں

جہاں میں ہوتے ہیں ایسے بھی کچھ ہُنر والے
جو اِک نگاہ میں امجد غلام کرتے ہیں

---

○

حسابِ عُمر کا اتنا سا گوشوارا ہے
تمھیں نکال کے دیکھا تو سب خسارا ہے

کسی چراغ میں ہم ہیں کسی کنول میں تُم
کہیں جمال ہمارا کہیں تمھارا ہے

وہ کیا وصال کا لمحہ تھا جس کے نشّے میں
تمام عُمر کی فرقت ہمیں گوارا ہے

ہر اک صدا جو ہمیں بازگشت لگتی ہے
نجانے ہم ہیں دوبارا کہ یہ دوبارا ہے!

وہ منکشف مری آنکھوں میں ہو کہ جلوے میں
ہر ایک حُسن کسی حُسن کا اشارا ہے

عجب اُصول ہیں اِس کاروبارِ دُنیا کے
کسی کا قرض کسی اور نے اُتارا ہے

کہیں یہ ہے کوئی خوشبو کہ جس کے ہونے کا
تمام عالمِ موجود، استعارا ہے

نجانے کب تھا! کہاں تھا! مگر یہ لگتا ہے
یہ وقت پہلے بھی ہم نے کبھی گزارا ہے

یہ دو کنارے تو دریا کے ہو گئے، ہم تم!
مگر وہ کون ہے جو تیسرا کنارا ہے!

○

اے گردشِ حیات کبھی تو دِکھا وہ نیند
جس میں شبِ وصال کا نشّہ ہو، لا وہ نیند

ہرنی سی ایک آنکھ کی مستی میں قید تھی
اِک عُمر جس کی کھوج میں پھرتا رہا، وہ نیند

پُھوٹیں گے اَب نہ ہونٹ کی ڈالی پہ کیا گلاب!
آئے گی اب نہ لَوٹ کے آنکھوں میں کیا، وہ نیند!

کُچھ رَت جگے سے جاگتی آنکھوں میں رہ گئے
زنجیرِ انتظار کا تھا سلسلہ، وہ نیند

دیکھا کچھ اِس طرح سے کسی خُوش نگاہ نے
رُخصت ہُوا تو ساتھ ہی لیتا گیا وہ ، نیند

خُوشبو کی طرح مجُھ پہ جو بکھری تمام شب
میں اُس کی مست آنکھ سے چُنتا رہا' وہ نیند

گھُومی ہے رتجگوں کے نگر میں تمام عُمر
ہر رہگذارِ درد سے ہے آشنا' وہ نیند

تُو جس کے بعد حشر کا میلہ سجائے گا!
میں جس کے انتظار میں ہُوں' اے خُدا، وہ نیند!

امجد ہماری آنکھ میں لَوٹی نہ پھر کبھی
اُس بے وفا کے ساتھ گئی بے وفا، وہ نیند



اہلِ نظر کی آنکھ میں تاج و کلاہ کیا !
سایا ہو جن پہ دَرد کا ، اُن کو پناہ کیا ؟

ٹھہرا ہے اِک نگاہ پہ سارا مقدّمہ
کیسے وکیل! کون سا مُنصف! گواہ کیا!

کرنے لگے ہو آٹھوں پہر کیوں خُدا کو یاد؟
اُس بُت سے ہو گئی ہے کوئی رسم و راہ کیا؟

اے ربِّ عدل تُو مری فردِ عمل کو چھوڑ
بس یہ بتا کہ اِس میں ہے میرا گُناہ کیا؟

سارے فراق سال دُھواں بن کے اُڑ گئے
ڈالی ہمارے حال پہ اُس نے نگاہ کیا !

کیا دل کے بعد آبروئے دِل بھی رُول دیں
دکھلائیں اُس کو جا کے یہ حالِ تباہ کیا ؟

جو جِتنا کم بساط ہے ، اُتنا ہے معتبر
یارو یہ اہلِ فقر کی ہے بارگاہ ، کیا !

کیسے کہیں کہ کر گئی اِک ثانیے کے بیچ
جادُو بھری وہ آنکھ ، وہ جھُبکتی نگاہ کیا !

(ق)

وہ بر بنائے جبر ہو یا اقتضائے صبر
ہر بُو الہوس سے کرتے رہو گے نباہ کیا ؟

ہر شے کی مثل ہو گی کوئی بے کسی کی حد !
اِس شہرِ بے ہُنر کا ہے دِن بھی سیاہ کیا ؟

رستے میں تھیں غنیم کے پھُولوں کی پتّیاں
سالار بک گئے تھے تو کرتی سپاہ کیا !

دِل میں کوئی اُمّید نہ آنکھوں میں روشنی
نکلے گی اِس طرح کوئی جینے کی راہ کیا ؟

امجدؔ نزولِ شعر کے کیسے بنیں اُصول !
سیلاب کے لیے کوئی ہوتی ہے راہ کیا ؟

---

○

عمر اک خواب سجانے میں گئی
تیری تصویر بنانے میں گئی

کٹ گئی کچھ تو غمِ ہجراں میں
اور کچھ مِلنے مِلانے میں گئی

ایک شعلہ سا کبھی لپکا تھا
زندگی آگ بجھانے میں گئی

ایسے سودے میں تو گھاٹا ہے، اگر
آبرو ، سر کے بچانے میں گئی!

تم بھی چاہو تو نہیں بن سکتی
بات ، جو بات بنانے میں گئی

رہ گئی کچھ تو ترے سُننے میں
اور کچھ اپنے سنانے میں گئی

عمر بھر کی تھی کمائی میری
جو ترے بام پہ آنے میں، گئی

عکس در عکس فقط حیرت تھی
عقل جب آئنہ خانے میں گئی

---



کسی کی دُھن میں، کسی کے گُماں میں رہتے ہیں
ہم ایک خواب کی صُورت جہاں میں رہتے ہیں

ہمارے اشک چمکتے ہیں اُس کی آنکھوں میں
زمیں کا رزق ہیں اور آسماں میں رہتے ہیں

جو لوگ کرتے ہیں دُنیا سے سُود کی خواہش
ہمیشہ گردشِ دورِ زیاں میں رہتے ہیں

نظر کے سامنے، آبِ رواں کے ہوتے ہُوئے
جو اہلِ صبر ہیں، تشنہ لباں میں رہتے ہیں

ہر اک بھنور سے زیادہ تباہ کار ہیں یہ
جو چند خوف پھٹے بادباں میں رہتے ہیں

اُنھی کے دم سے ہے جاری یہ روشنی کا سفر
جو دل چراغ کی صُورت جہاں میں رہتے ہیں

یہ اہلِ درد ہیں اِن کا چلن ہے سب سے الگ
مکان رکھتے ہیں اور لامکاں میں رہتے ہیں

یہ جان کر بھی کہ انتم ہے بھُربھری مٹی
یہ لوگ خواہشِ نام و نشاں میں رہتے ہیں!

کسی سراب کی صُورت، کسی گُماں کی طرح
ہم اپنے ہست کی ریگِ رواں میں رہتے ہیں

سمے کا چاک ہے اور خاک ہے حوادث کی
زمین زاد، سدا امتحاں میں رہتے ہیں

یہ معجزہ جو نہیں ہے تو اور کیا ہے، جاں!
کہ آگ ہیں اور خاکداں میں رہتے ہیں

ہمارے بختِ ستم ساز کا کمال ہے یہ
گُلِ بہار ہیں لیکن خزاں میں رہتے ہیں

حصارِ دشت میں متروک راستوں کی طرح
ہمارے گیت، ترے گُلستاں میں رہتے ہیں

مکاں کی قید سے، حدِّ زماں سے باہر
ہم اپنے ذہن کی موجِ رواں میں رہتے ہیں

غموں کی دُھوپ سے ڈرتے نہیں ہیں وہ امجد
کسی نگاہ کے جو سائباں میں رہتے ہیں

○

ہمارے سارے خواب، جاں!
تری ہی سمت ہیں رواں

یہی اُدھورے راستے
ہیں منزلوں کے ترجماں

بچھی ہُوئی زمین پر
جُھکے ہیں سات آسماں

بنیں گی اَبر ایک دن،
یہ چھوٹی چھوٹی بدلیاں

ہے لفظ روشنی
صداقتوں کے درمیاں

(ق)

جو زندگی فروش تھے
وہی ہیں شہر کی زباں

جو خود زمیں کا بوجھ ہیں
بنے ہیں میرِ کارواں

جو روشنی کے چور تھے
وہی ہیں روشنی نشاں

(ق)

غلام سر اُٹھائیں گے
کہاں تھا تخت کو گماں!

زمین کھا گئی اُنھیں
جو بن رہے تھے آسماں

جو زندگی کا حُسن تھے
وہ لوگ رہ گئے کہاں

بہت تلاش ہو چکی
بس اب تو تھک گئے میاں

کہاں ہیں میرے ہم نفس
کہاں ہیں میرے ہم زباں!

ہیں خلاؤں میں کتنی دُنیائیں
جو کسی حدِّ آگہی میں نہیں!

ہو کلیسا، حَرم کہ بُت خانہ
فرق ان میں ہے، بندگی میں نہیں

ایک اِنساں ہے، زندگی جَیسا
اور وہ میری زندگی میں نہیں!

تُو نہیں، تیرا غم ہے چاروں طَرف
جس طرح چاند، چاندنی میں نہیں

اَجر تو صَبر کے جلو میں ہے
موجِ دَریا میں، تشنگی میں نہیں

ایک بے نام سے خلا کے سوا
کون سا رنگ، کافری میں نہیں!

یوں تو کیا چیز زندگی میں نہیں
جیسے سوچی تھی اپنے جی میں، نہیں

دِل ہمارا ہے چاند کا وہ رُخ
جو ترے رُخ کی روشنی میں نہیں

سب زمانوں کا حال ہے اِس میں
اِک وہی شام، جنتری میں نہیں!

ایک گردابِ بے خُودی کے سوا
کیا تماشا ہے جو خُودی میں نہیں!

ہے ہمارا وہ مُدّعا امجدؔ
کوئی بھی جس کی پیروی میں نہیں

---



اَب تک نہ کھُل سکا کہ مرے رُوبرو ہے کون!
کس سے مکالمہ ہے! پسِ گفتگو ہے کون!

سایا اگر ہے وہ تو ہے اُس کا بدن کہاں؟
مرکز اگر ہوں میں تو مرے چار سُو ہے کون!

ہر شے کی ماہیت پہ جو کرتا ہے تُو سوال
تجھ سے اگر یہ پُوچھ لے کوئی کہ تُو ہے کون!

اشکوں میں جھلملاتا ہُوا کس کا عکس ہے!
تاروں کی رہگذار میں یہ ماہ رُو ہے کون!

باہر کبھی تو جھانک کے کھڑکی سے دیکھتے!
کِس کو پُکارتا ہُوا یہ کُو بہ کُو ہے کون!

آنکھوں میں رات آ گئی لیکن نہیں کھُلا
میں کِس کا مدّعا ہُوں؟ مِری جستجو ہے کون!

کِس کی نگاہِ لُطف نے موسم بدل دیئے
فصلِ خزاں کی راہ میں یہ مُشکبو ہے کون!

بادل کی اوٹ سے کبھی تاروں کی آڑ سے
چُھپ چُھپ کے دیکھتا ہُوا یہ حیلہ جُو ہے کون!

تارے ہیں آسماں میں جیسے زمیں پہ لوگ
ہر چند ایک سے ہیں مگر ہُوبہو ہے کون!

ہونا تو چاہیے کہ یہ میرا ہی عکس ہو!
لیکن یہ آئینے میں مِرے رُو برُو ہے کون!

اِس بے کنار پھیلی ہُوئی کائنات میں
ِس کو خبر کہ کون ہوں مَیں! اور تُو ہے کون!

ارا فساد بڑھتی ہُوئی خواہشوں کا ہے
ِل سے بڑا جہان میں امجدؔ عدُو ہے کون!

---

○

گردِ سفر میں بھول کے منزل کی راہ تک
پھر آ گئے ہیں لوگ نئی قتل گاہ تک

اِک بے کسی کا جال ہے پھیلا چہار سُو
اِک بے بسی کی دُھند ہے دِل سے نگاہ تک

بالائے سطحِ آب تھے جتنے تھے بے خبر
اُبھرے نہیں ہیں وہ کہ جو پہنچے ہیں تھاہ تک

اِک دُوسرے پہ جان کا دینا تھا جس میں کھیل
اب رہ گیا ہے صرف وہ رشتہ نباہ تک

اہلِ نظر ہی جانتے ہیں کیسے اُفق مثال!
حدِّ ثواب جاتی ہے حدِّ گناہ تک

زنجیرِ عدل اب نہیں کھینچے گا کوئی ہاتھ
رُلنے ہیں اب تو پاؤں میں تاج و کُلاہ تک

پھُولوں سے اِک بھری ہُوئی بستی یہاں پہ تھی
اب دل پہ اس کا ہوتا نہیں اشتباہ تک

آتی ہے جب بہار تو آتی ہے ایک ساتھ
باغوں سے لے کے دشت میں اُگتی گیاہ تک

جانا ہے ہم کو خواب کی کشتی میں بیٹھ کر
کاجل سے اِک بھری ہُوئی چشمِ سیاہ تک

جذبات بُجھ گئے ہوں تو کیسے جلے یہ دِل
میرِ سپہ کا نام ہے اُس کی سپاہ تک

امجد اب اس زمین پہ آنے کو ہے وہ دِن
عالم کے ہاتھ پہنچیں گے عالم پناہ تک

---

○

دِل کے کہنے پہ جب لڑے تم تھے
پھر زمانے سے کیوں ڈرے تم تھے

نقش تھے ہاتھ کی لکیروں میں
دسترس سے مگر پرے تم تھے

لاکھ پھیلا، سمٹ نہ پائے تم
دل کی اوقات سے بڑے تم تھے

ہم نے جس رہ کا انتخاب کیا
اُس کے ہر موڑ پر کھڑے تم تھے

اِک شرارِ گُماں کی مانند !
دھیان کی راکھ میں پڑے تم تھے

(ق)

جانے کِس لہر میں تھا میں سرشار!
جانے کِس موج میں ہَرے تم تھے!

ہاتھ کے لمس سے چھلک اُٹھے
جامِ مے کی طرح بھرے تم تھے

کیا تھا! جس میں اُلجھ گیا تھا میں
جانے کِس بات پر اَڑے تم تھے؟

ایک ہی لمحۂ خموشی میں
حدِّ آواز سے پرے تم تھے

○

یہ بولتے ہوئے لمحے یہ ڈولتی ہُوئی شام
ترے جمال کے صدقے، ترے وصال کے نام

خُدا کرے سَدا کِھلتے رہیں — چلیں یوں ہی
ترے لبوں کے ستارے تری نظر کے جام

ترے بَدن کی پہیلی میں رُک گئی خوشبُو
ترے لباس پہ آکر ہُوئے ہیں رنگ تمام

طلسمِ بندِ قبا سے ہیں اُنگلیاں روشن
لہُو میں آگ کی صُورت اُتر رہی ہے شام

مہک وفا کی سدا ساتھ ساتھ چلتی رہے
محبتوں کے سفر کا بخیر ہو انجام

متاعِ دزد تو ورثہ ہے آنکھ والوں کا
تجھے یہ زخم مبارک ہو اے دلِ ناکام!

بھٹک رہے ہیں کسی خواب کی طرح کب سے
اس آس پہ کہ تری آنکھ میں کریں آرام

میں اُس گلی سے گزرتا ہوں بار بار امجد
کبھی تو بام پہ آئے گا میرا ماہِ تمام

---

○

کلام کرتی نہیں بولتی بھی جاتی ہے
تری نظر کو یہ کیسی زبان آتی ہے!

کبھی کبھی مجھے پہچانتی نہیں وہ آنکھ
کبھی چراغ سے چاروں طرف جلاتی ہے

عجب تضاد میں پلتی ہے تیرے وصل کی آس
کہ ایک آگ بجھاتی ہے اک لگاتی ہے

وہ دیکھتی ہے مجھے ایسی مست نظروں سے
مرے لہو میں کوئی آگ سرسراتی ہے

یہ چار سُو کا اندھیرا سمٹنے لگتا ہے
کچھ اِس طرح تری آواز جگمگاتی ہے

یہ کوئی اور نہیں آگ ہے یہ اندر کی
بدن کی رات میں جو روشنی بچھاتی ہے

مَیں اس کو دیکھتا رہتا ہوں رات ڈھلنے تک
جو چاندنی تری گلیوں سے ہو کے آتی ہے

یہ روشنی بھی عطا ہے تری محبّت کی
جو میری رُوح کے منظر مجھے دکھاتی ہے

اُمیدِ وصل بھی امجدؔ ہے کانچ کی چُوڑی
کہ پہننے میں کئی بار ٹوٹ جاتی ہے

○

لبوں پہ رُکتی، دِلوں میں سما نہیں سکتی
وہ ایک بات جو لفظوں میں آ نہیں سکتی

جو دِل میں ہو نہ زرِ غم تو اشک پانی ہے
کہ آگ خاک کو کُندن بنا نہیں سکتی!

یقیں گمان سے باہر تو ہو نہیں سکتا
نظر خیال سے آگے تو جا نہیں سکتی!

دِلوں کی رمز فقط اہلِ دَرد جانتے ہیں
تری سمجھ میں مری بات آ نہیں سکتی

یہ سوزِ عشق تو گونگے کا خواب ہے جیسے
مری زباں، مری حالت بتا نہیں سکتی

(ق)

سمٹ رہی ہے مرے بازوؤں کے حلقے میں
حیا کے بوجھ سے پلکیں اُٹھا نہیں سکتی

جو کہہ رہا ہے سُلگتا ہُوا بدن اُس کا
بتا بھی پاتی نہیں اور چھُپا نہیں سکتی

اِک ایسی ہجر کی آتش ہے میرے دل میں جسے
کسی وصال کی بارش بُجھا نہیں سکتی

تو جو بھی ہونا ہے امجدؔ یہیں پہ ہونا ہے
زمیں مدار سے باہر تو جا نہیں سکتی!

○

یہ گردبادِ تمنّا میں گھُومتے ہُوئے دِن
کہاں پہ جا کے رُکیں گے یہ بھاگتے ہُوئے دِن!

غروب ہوتے گئے رات کے اندھیروں میں
نویدِ امن کے سُورج کو ڈھونڈتے ہُوئے دِن

نجانے کون خلا کے یہ استعارے ہیں!
تُمھارے ہجر کی گلیوں میں گُونجتے ہُوئے دِن

نہ آپ چلتے، نہ دیتے ہیں راستہ ہم کو
تھکی تھکی سی یہ شامیں، یہ اُونگھتے ہُوئے دِن

پھر آج کیسے کٹے گی پہاڑ جیسی رات!
گزر گیا ہے یہی بات سوچتے ہُوئے دِن

تمام عُمر مِرے ساتھ ساتھ چلتے رہے
تجھے تلاشتے، تجھ کو پکارتے ہُوئے دِن

ہر ایک رات جو تعمیر پھر سے ہوتی ہے
کٹے گا پھر وہی دیوار چاٹتے ہُوئے دِن

مِرے قریب سے گزرے ہیں بارہا امجدؔ
کِسی کے وصل کے وعدے کو دیکھتے ہُوئے دِن

---

O

جو رستہ بھی دل نے چُنا ہے
تیرے غم کی سمت کھُلا ہے

پانی پر جو حرف لکھا تھا
دیکھو، کیسے ٹھہر گیا ہے

ڈھلتی شام کے سائے سائے
تُو ہے، تیرا غم ہے! کیا ہے!

آگ بُجھے تو مُدّت گزری
آنکھوں میں کیا پھیل رہا ہے؟

ایک سوال ہلا تھا، مجھ کو
میں نے تجھ کو مانگ لیا ہے

یوں لگتا ہے جیسے کوئی
مجھ کو مسلسل دیکھ رہا ہے

شام کی اُنگلی تھام کے سُورج
بھُوکا پیاسا لوٹ رہا ہے

طشتِ فلک میں تارے بھر کر
چاند کسے ملنے جاتا ہے!

بارش کی آواز سے امجد
شہر کا چہرہ کِھل اُٹھا ہے

ربط ہے نہ معانی، کہیں تو کس سے کہیں!
م اپنے غم کی کہانی، کہیں تو کس سے کہیں!

ملیں ہیں برف کی سینوں میں اب دِلوں کی جگہ
یہ سوزِ دردِ نہانی، کہیں تو کس سے کہیں!

نہیں ہے اہلِ جہاں کو خود اپنے غم سے فراغ
ہم اپنے دِل کی گرانی، کہیں تو کس سے کہیں!

پلٹ رہے ہیں پرندے، بہار سے پہلے
عجیب ہے یہ نشانی، کہیں تو کس سے کہیں!

نئے سخن کی طلب گار ہے نئی دُنیا
وہ ایک بات پرانی، کہیں تو کس سے کہیں

نہ کوئی سُنتا ہے امجدؔ نہ مانتا ہے اِسے
حدیثِ شامِ جوانی، کہیں تو کس سے کہیں!

---



دُنیا کا کچھ بُرا بھی تماشا نہیں رہا
دِل چاہتا تھا جس طرح ویسا نہیں رہا

تُم سے ملے بھی ہم تو جُدائی کے موڑ پر
کشتی ہُوئی نصیب تو دریا نہیں رہا

کہتے تھے ایک پَل نہ جئیں گے ترے بغیر
ہم دونوں رہ گئے ہیں وہ وعدہ نہیں رہا

کاٹے ہیں اس طرح سے ترے بعد روز و شب
میں سانس لے رہا تھا پہ زندہ نہیں رہا

آنکھیں بھی دیکھ دیکھ کے خواب آ گئی ہیں تنگ
دِل میں بھی اب وہ شوق، وہ پہلا نہیں رہا

کیسے ملائیں آنکھ، کسی آئنے سے ہم
امجد ہمارے پاس تو چہرہ نہیں رہا

---



کچھ اس طرح دیکھا کسی بے وفا نے
غضب ہو گئے چند آنسو چھپانے

علی الرغم دُنیا پھر اس بار بھی ہم
ڈٹے ہیں ترے سامنے لے زمانے!

وُہی خُونِ آدم کی بے چارگی ہے
وہی ہیں جبینیں، وہی آستانے!

مقدّر نہ بدلا تو مجبُور ہو کر
خُدا کتنے بدلے ہیں خلقِ خُدا نے!

(12) کسی بے وفا کو نہ قسمت دکھلائے
ہمیں جو دکھایا ہماری وفا نے

کچھ اِس طرح رہتے ہیں ہم پاس اس کے
کہ جیسے گھروں میں کھلونے پرانے

---

جو کچھ دیکھا جو سوچا ہے وُہی تحریر کر جائیں !
جو کاغذ اپنے حصّے کا ہے وہ کاغذ تو بھر جائیں !

نشے میں نیند کے، تارے بھی، اِک دُوجے پہ گرتے ہیں
تھکن رستوں کی کہتی ہے چلو اب اپنے گھر جائیں

کچھ ایسی بے حسی کی دُھند سی پھیلی ہے آنکھوں میں
ہماری صُورتیں دیکھیں تو آئینے بھی ڈر جائیں

نہ ہمت ہے غنیمِ وقت سے آنکھیں ملانے کی
نہ دل میں حوصلہ اِتنا کہ مٹّی میں اُتر جائیں

گُلِ اُمید کی صُورت ترے باغوں میں رہتے ہیں
کوئی موسم ہمیں بھی دے کہ اپنی بات کر جائیں

دیارِ دشت میں ریگِ رواں جن کو بناتی ہے
بتا اے منزلِ ہستی کہ وہ رستے کدھر جائیں

تو کیا اے قاسمِ اشیاء، یہی آنکھوں کی قسمت ہے
اگر خوابوں سے خالی ہوں تو پچھتاووں سے بھر جائیں

جو بخشش میں ملے امجدؔ، تو اُس خُوشبو سے بہتر ہے
کہ اس بے فیض گلشن سے بندھی مُٹھی گزر جائیں

---

ھکی تھکی سی تنہائی ہے گھُٹی گھُٹی بیزاری ہے
ہ کیسے گرداب میں ہم نے کشتئ خواب اُتاری ہے

مس و قمر کے جادُو گھر میں، بحر و بر کی حیرت میں
یوں لگتا ہے جیسے اب تک "کُن" کا کلمہ جاری ہے

اک اور خُوں کا رِزق کیے ہیں کتنے رنگ اور کتنے نقش
صفحۂ جاں پر تب جا کر یہ اِک تصویر اُبھاری ہے

رُوح کے اندر جتنے دیئے ہیں سب ہی جلا لو آج کی رات
جاگنے والو آج کی شب کا لمحہ لمحہ بھاری ہے

دشتِ وفا کے پیڑ عجب ہیں پھل بھی نہیں چھاؤں بھی نہیں
اور سفر میں آنے والا اِک اِک چشمہ کھاری ہے

تو یہ چراغِ آزادی کی امجدؔ قائم دائم ہو
میرے بڑوں نے اپنے لہو سے اس کی نذر اُتاری ہے



---

کوئی خواب دشتِ فراق میں سرِ شام چہرہ کشا ہُوا
مری چشمِ تر میں رُکا نہیں کہ تھا رَت جگوں کا ڈسا ہُوا

مرے دِل کو رکھتا ہے شادماں مرے ہونٹ رکھتا ہے گُل فشاں
وہی ایک لفظ جو آپ نے مرے کان میں ہے کہا ہُوا

ہے نگاہ میں مری آج تک وہ نگاہ کوئی جھکی ہُوئی
وہ جو دھیان تھا کسی دھیان میں، وہیں آج بھی ہے لگا ہُوا

مرے رَت جگوں کے فشار میں، مری خواہشوں کے غبار میں
وُہی ایک وعدہ گلاب سا سرِ نخلِ جاں ہے کھلا ہُوا

تری چشمِ خوش کی پناہ میں کسی خوابِ زار کی راہ میں
مرے غم کا چاند ٹھہر گیا کہ تھا رات بھر کا تھکا ہُوا

ہے یہ مختصر، رہِ عشق پر، نہیں آپ ہم، رہے ہم سفر
تو ہو کس لیے یہ مباحثہ، کہاں! کون! کیسے! جُدا ہُوا

کسی دل کُشا سی پکار سے اُسی ایک بادِ بہار سے
کہیں برگ برگ نمو ملی، کہیں زخم زخم ہرا ہُوا

ترے شہرِ عدل سے آج کیا سبھی دزد مند چلے گئے
نہیں کاغذی کوئی پیرہن، نہیں ہاتھ کوئی اُٹھا ہُوا

---

○

پہلو سے اُٹھ کے آپ کچھ ایسی ادا سے کل گئے
بُجھ گیا شعلۂ نوا، تاروں کے پھول جل گئے

حشر کے دن پہ جا پڑا، تیرا مرا معاملہ
یعنی ادق مقام تھے، اچھّا ہُوا کہ ٹل گئے

زد پہ کوئی ہدف نہ تھا، تانی ہوئی کماں نہ تھی
ترکشِ جاں کے تیر سب اپنی ہی سمت چل گئے

آئینۂ ماہ و سال میں ہم تجھے جوڑتے رہے
آنکھوں میں دُھند بھر گئی، عکس بدل بدل گئے

ہم نے ترے خیال میں ڈھونڈا ترے جمال کو
لفظوں کی دیکھ بھال میں معنی کہیں نکل گئے

---



جاہ کی خواہشِ بے فیض پہ مرنے والے
کسی اِنسان کی عزّت نہیں کرنے والے

وہی اب شہر کی نظروں میں شناور ٹھہرے
لبِ دریا جو کھڑے تھے کئی ڈرنے والے

کس قدر خواب ابھی شعر بنانے ہیں، ہمیں
کتنے خاکوں میں ابھی رنگ ہیں بھرنے والے!

وقت پر زور نہیں، عمر چلی جاتی ہے
سینکڑوں کام پڑے ہیں ابھی کرنے والے

بھول ہو گی تو اُسے دِل سے کریں گے تسلیم
ہم نہیں دوش کسی اور پہ دھرنے والے

دیکھ لے آنکھ اُٹھا کر ہمیں اے سیلِ ہوس
نہیں اِس شہر کے سب لوگ بکھرنے والے

پیار بٹنے سے کبھی ختم نہ ہو گا امجد
دل کے دریا تو نہیں ہوتے اُترنے والے



○

باغِ جہاں سے صُورتِ شبنم چلے گئے
کیا کیا کُلاہ و مَسند و پرچم چلے گئے

ہم تک خُود اپنی گھُوم کے آنے لگی صَدا
کیا سب نوائے درد کے محرم چلے گئے؟

اُن کا حساب کون دے اے ربِّ نطق و صَوت؟
جو حرف، ناشنیدہ و مبہم چلے گئے

تُم نے نگاہ پھیر کے دیکھا بس ایک پَل
اُس ایک پَل میں کتنے ہی موسم چلے گئے

عالم وُہی ہے آج بھی، لیکن جو دیکھیے!
جتنے تھے لوگ اُتنے ہی عالم، چلے گئے

روشن اُسی طرح سے ہے اہلِ ہُنر کی خاک
ساغر کے ساتھ ساتھ کئی جم، چلے گئے

جاگا نہ نخلِ دارِ وفا پر کوئی چراغ
امجدؔ تو سر کو شمع کیے، ہم، چلے گئے





دِل ترے غم کی بارگاہ میں ہے
جیسے قیدی حضورِ شاہ میں ہے

شہر والوں کو کچھ خبر ہی نہیں
کیسا سیلاب آج راہ میں ہے

ہے تعلّق تو ایک سادہ لفظ
پھیر جو بھی ہے وہ نباہ میں ہے

حادثہ ہو چکا کہ ہونا ہے!
بھیڑ کیسی یہ شاہراہ میں ہے!

سر میں بھی ہو یہ لازمی تو نہیں !
جو فضیلت کسی کُلاہ میں ہے !

دیکھنے میں تو ایک ہے دریا
سطح پر وہ نہیں جو تھاہ میں ہے

ہم کسی تیسرے کی منزل ہیں
دل کسی دُوسرے کی راہ میں ہے

(ق)

رُوحِ درویش تو ہے لنگر میں
اور بدن اُس کا خانقاہ میں ہے

فیض وہ ہے جو خلق کو پُہنچے
کب یہ پتّھر کی بارگاہ میں ہے!

اُس کو رنگِ جہاں سے کیا ڈرنا
جو تری چشم کی پناہ میں ہے

(ق)

وہ سیاہی تو رات میں بھی نہیں
جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

جیسے دُکّانِ شیشہ گر میں بیل
وقت ، یوں دل کی کارگاہ میں ہے

گردِ بادِ وفا کی منزل ہی
دامنِ دشتِ بے پناہ میں ہے

نارسا بخت کا گِلہ کیسا !
جب سفر ہی تمام راہ میں ہے

درد وہ مضمحل پرندہ ہے
جس کا گھر ہی دلِ تباہ میں ہے

---

کب سے میں نے پلک نہیں جھپکی!
کوئی امجدؔ مری نگاہ میں ہے!

---



ہے محبّت کا سلسلہ کچھ اور
درد کچھ اور ہے دوا کچھ اور!

غم کا صحرا عجیب صحرا ہے
جتنا کاٹا یہ بڑھ گیا کچھ اور

کیسی قسمت ہے آنکھ والوں کی!
ہر تماشے میں دیکھنا کچھ اور

عمر ساری تضاد میں گزری
ہونا کچھ اور، سوچنا کچھ اور

بھیڑ میں آنسوؤں کی سن نہ سکا
تم نے شاید کہا تو تھا کچھ اور!

کم نہیں وصل سے فراق ترا
اس زیاں میں ہے فائدہ کچھ اور

دل کسی شے پہ مطمئن ہی نہیں
مانگتا ہے یہ اژدہا، کچھ اور

تیرے غم میں حساب عمرِ رواں
جتنا جوڑا، بکھر گیا کچھ اور

وصل کی رات کاٹنے والے
ہے شبِ غم کا ذائقہ کچھ اور

ہر طرف بھیڑ تھی طبیبوں کی
روگ بڑھتا چلا گیا کچھ اور

کٹ گئے دھار پہ زمانے کی،
ہم سے امجد نہ ہو سکا کچھ اور

اِک نام کی اُڑتی خوشبو میں اِک خواب سفر میں رہتا ہے
اِک بستی آنکھیں ملتی ہے، اِک شہر نظر میں رہتا ہے

کیا اہلِ ہُنر، کیا اہلِ شرف، سب ٹکڑے ردّی کاغذ کے
اِس دَور میں ہے وہ شخص بڑا جو روز خبر میں رہتا ہے

پانی میں روز بہاتا ہے اِک شخص دیئے اُمّیدوں کے
اور اگلے دن تک پھر ان کے ہمراہ بھنور میں رہتا ہے

اِک خوابِ ہُنر کی آہٹ سے کیا آگ لہو میں جلتی ہے
کیا لہر سی دل میں چلتی ہے! کیا نشّہ سر میں رہتا ہے

جو پیڑ پہ لکھی جاتی ہے، جو گیلی ریت سے بنتا ہے
کون اُس تحریر کا وارث ہے! کون ایسے گھر میں رہتا ہے!

ہر شام، سُلگتی آنکھوں کو، دیوار میں چُن کر جاتی ہے
ہر خواب، شکستہ ہونے تک، زنجیرِ سحر میں رہتا ہے!

یہ شہر کتھا بھی ہے امجد اِک قصّہ سوتے جاگتے کا!
ہم دیکھیں جس کردار کو بھی جادو کے اثر میں رہتا ہے



محبّت کا ثمر ملتا نہیں ہے
یہ سکّہ اب کہیں چلتا نہیں ہے

ہمیں کیا جو سخن دُنیا میں گونجا
جسے سُننا تھا وہ سُنتا نہیں ہے

ہم اہلِ دل، سرِ بازارِ دُنیا
کھڑے ہیں، راستہ ملتا نہیں ہے

سفر جاری اگر ہے رہنماؤ!
تو پھر کیوں فاصلہ گھٹتا نہیں ہے

تم اپنے بادباں کھولو نہ کھولو
سمندر تو کبھی رُکتا نہیں ہے!

ہری رہتی ہے کشتِ دل ہمیشہ
کسی رُت میں اِسے چنتا نہیں ہے

سحر سے شام ہونے آ گئی ہے
کوئی دردآشنا ملتا نہیں ہے

ہمارا دل ہے یوں قصرِ جہاں میں
وہ پتّھر، جو کہیں لگتا نہیں ہے

ہوائے شامِ غم بوجھل ہے اِتنی
چراغِ آرزو جلتا نہیں ہے

زمانہ آپ ہی بدلے تو بدلے
کسی کا زور تو چلتا نہیں ہے

نہیں امجد کوئی قیمت وفا کی
یہ سودا اب یہاں بکتا نہیں ہے



اِک سرابِ سیمیا میں رہ گئے
لوگ جو بیم و رجا میں رہ گئے

کس شبِ نغمہ کی ہیں یہ یادگار!
چند نوحے جو ہوا میں رہ گئے

پی لیے کچھ اشک پاسِ عشق نے
کچھ فشارِ التجا میں رہ گئے

کھو گئے کچھ حرف دشتِ ضبط میں
کچھ غبارِ مدّعا میں رہ گئے

چند جستوں کا یہ سارا کھیل ہے
رہ گئے، جو ابتدائیں، رہ گئے

سبز سایہ دار پیڑوں کی طرح
رفتگاں، دشتِ وفا میں رہ گئے

حاصلِ عمرِ رواں، وہ وقت، جو
ہم تری آب و ہوا میں رہ گئے

ہے لہو کا قافلہ اَب تک رواں
اور قاتل، کربلا میں رہ گئے

ہم ہیں امجد اُن حقائق کی طرح
جو بیانِ واقعہ میں رہ گئے

○

دستک کسی کی ہے کہ گماں دیکھنے تو دے!
دروازہ ہم کو تیز ہُوا، کھولنے تو دے!

اپنے لہو کی تال پہ خواہش کے مور کو،
اے دشتِ احتیاط! کبھی ناچنے تو دے

سَودا ہے عُمر بھر کا، کوئی کھیل تو نہیں
اے چشمِ یار، مجھ کو ذرا سوچنے تو دے!

اُس حرفِ "کُن" کی ایک امانت ہے میرے پاس
لیکن یہ کائنات مجھے بولنے تو دے!

شاید کسی لکیر میں لکھا ہوا میرا نام
اے دوست اپنا ہاتھ مجھے دیکھنے تو دے

یہ سات آسمان کبھی مختصر تو ہوں
یہ گھومتی زمین کہیں ٹھہرنے تو دے!

کیسے کسی کی یاد کا چہرہ بناؤں میں!
امجد وہ کوئی نقش کبھی بھولنے تو دے





عشق ایسا عجیب دریا ہے
جو بنا ساحلوں کے بہتا ہے

ہیں غنیمت یہ چار لمحے بھی
پھر نہ ہم ہیں، نہ یہ تماشا ہے

زندگی اِک دُکاں کھلونوں کی
وقت، بگڑا ہوا سا بچّہ ہے

اے سرابوں میں گھومنے والے!
دل کے اندر بھی ایک رستہ ہے

اِس بھری کائنات کے ہوتے
آدمی، کس قدر، اکیلا ہے!!

آئنے میں جو عکس ہے امجد
کیوں کسی دُوسرے کا لگتا ہے!



○

جو زخم تُو نے دیئے تھے وہ بھرتے جاتے ہیں
چڑھے ہُوئے تھے جو دریا، اُترتے جاتے ہیں

سمیٹ لے مجھے بانہوں میں اے فراق کی رات
فلک پہ دیکھ ستارے بکھرتے جاتے ہیں

یہ اہلِ شہرِ وفا ہیں عجب بہار پرست
سروں کے پھُول فصیلوں پہ دھرتے جاتے ہیں

نہیں ہے اور تو کچھ بھی ہمارے ہاتھوں میں
سوائے عرضِ تمنّا، سو کرتے جاتے ہیں

عجیب لوگ ہیں یہ اہلِ انتظار کہ جو
خُود اپنی آگ میں جل کر سنورتے جاتے ہیں

نجانے کون سی بستی کے ہیں یہ باشندے!
نظر اُٹھاتے نہیں اور گزرتے جاتے ہیں

یہ آج شہر پہ اُتری ہے کِس بلا کی رات
چراغ اپنی لَوؤں سے مُکرتے جاتے ہیں

درخت شام کو لگتے ہیں شہر سے امجد
کہ شاخ شاخ پرندے اُترتے جاتے ہیں



سب ہیں بِکنے والے ہاتھ
کیا تیرے، کیا میرے ہاتھ

لہُو نہ مُخبر ہو جائے
دیکھو اپنے اپنے ہاتھ

بول فنا کے لمحے، بول
منزل ہے اَب کِتنے ہاتھ!

رُکے نہیں اور جُھکے نہیں
سچّی باتیں لکھتے ہاتھ

رنگوں کی آواز سُنی
دیکھے باتیں کرتے ہاتھ!

(ق)

کِس سے مِل کر جھُوما دل
کِس کو چھُو کر مہکے ہاتھ

پوریں جُگنو ہو جائیں
کُنجِ بدن میں بھٹکے ہاتھ

(ق)

اہلِ ہُنر نے دیکھو تو!
کِس کِس بھاؤ بیچے ہاتھ

مفلس کی بیٹی، قانون
چوروں کے ہیں لمبے ہاتھ

کِس سے ہیں انصاف طلب!
سِمٹی چیخیں، پھَیلے ہاتھ

ہاتھوں ہاتھ نِکل جائیں
نقلی موتی، جھُوٹے ہاتھ

چھین جھپٹ کا موسم ہے
کون لگے گا، کِس کے ہاتھ

(ق)

گھر کی خاطر گھر سے دُور
تھک گئے اینٹیں چُنتے ہاتھ

ریگِ رواں کا رِزق ہُوئے
صحرا صحرا، سِکتنے ہاتھ

پیٹ جہنم بھرنے کو
جنّت چھوڑ کے نکلے ہاتھ

اَنت امانت مِٹّی کی
کیا مہنگے، کیا سستے ہاتھ

امجدؔ ہاتھ سے چھُوٹا پَل
کب آتا ہے مُڑ کے ہاتھ

---



ہمارے بعد ہیں کچھ لوگ کیسے، دیکھ تو آئیں
چلو اُس شہر کو اِک بار پھر سے، دیکھ تو آئیں

بہت دن سے سمندر کی ہَوا گُم سُم سی آتی ہے
نہ ہوں طوفان کے رُخ پر سفینے، دیکھ تو آئیں

کسی دن آرزُوں کے کھنڈر میں جھانک کر ہم بھی
درو دیوار پر کیا کیا ہیں جالے، دیکھ تو آئیں

ہَوا میں ڈولتی خوشبو، پتہ خود ہی بتا دے گی
چلو رستوں پہ تھوڑی دُور چل کے، دیکھ تو آئیں

ہمارا نام سُنتے ہی کسی مہ وش کی آنکھوں میں
چمک اُٹھتے ہیں کیا اب بھی ستارے! دیکھ تو آئیں

بہت دُھندلے سہی شیشے سرِ بزمِ وفا امجد
مگر اک بار وہ گُم گشتہ چہرے دیکھ تو آئیں

○

بدن سے اُٹھتی تھی اُس کے خوشبو، صبا کے لہجے میں بولتا تھا
یہ میری آنکھیں تھیں اُس کا بستر، وہ میرے خوابوں میں جاگتا تھا

حیا سے پلکیں جُھکی ہُوئی تھیں، ہَوا کی سانسیں رُکی ہوئی تھیں
وہ میرے سینے میں سر چُھپائے، نجانے کیا بات سوچتا تھا!

کوئی تھا چشمِ کرم کا طالب، کسی پہ شوقِ وصال غالب
سوال پھیلے تھے چار جانب، بس ایک میں تھا جو چُپ کھڑا تھا

عجیب صحبت، عجیب رُت تھی، خموش بیٹھے ہوئے تھے دونوں
میں اُس کی آواز سُن رہا تھا، وہ میری آواز سُن رہا تھا

بہار آئی تو تتلیوں کے پروں میں رنگوں کے خواب جاگے
اور ایک بھنورا کلی کلی کے لبوں کو رہ رہ کے چومتا تھا

وہ اور ہوں گے کہ جن کو امجد نئے مناظر کی چاہ ہوگی
میں اُس کے چہرے کو دیکھتا ہوں میں اُس کے چہرے کو دیکھتا تھا

---



یہ کون آج مری آنکھ کے حصار میں ہے
مجھے لگا کہ زمیں میرے اختیار میں ہے

چراغِ رنگِ نوا، اب کہیں سے روشن ہو
سکوتِ شامِ سفر، کب سے انتظار میں ہے

کچھ اس طرح ہے تری بزم میں یہ دل، جیسے
چراغِ شامِ خزاں، جشنِ نو بہار میں ہے

مری حیات کے سارے سفر پہ بھاری ہے
وہ ایک پل جو تری چشمِ اعتبار میں ہے

جو اُٹھ رہا ہے کسی بے نشان صحرا میں
نشانِ منزلِ ہستی اُسی غبار میں ہے

ہماری کشتیٔ دل میں بھی اب نہیں وہ زور
تمھارے حُسن کا دریا بھی اب اُتار میں ہے

کبھی ہے دُھوپ کبھی ابرِ خُوش نما امجدؔ
عجب طرح کا تلوّن مزاجِ یار میں ہے

---

○

کوئی موسم ہو دل میں ہے تمھاری یاد کا موسم
کہ بدلا ہی نہیں جاناں، تمھارے بعد کا موسم

نہیں تو آزما کر دیکھ لو، کیسے بدلتا ہے
تمھارے مُسکرانے سے دلِ ناشاد کا موسم

صدا تیشے سے جو نکلی، دلِ شیریں سے اُٹھی تھی
چمن خسرو کا تھا لیکن رہا فرہاد کا موسم

پرندوں کی زباں بدلی کہیں سے ڈھونڈ لے تُو بھی
نئی طرزِ فغاں لے دل کہ ہے ایجاد کا موسم

رُتوں کا قاعدہ ہے وقت پر یہ آتی جاتی ہیں
ہمارے شہر میں کیوں رُک گیا فریاد کا موسم!

کہیں سے اُس حسیں آواز کی خوشبو پکارے گی
تو اُس کے ساتھ بدلے گا دلِ برباد کا موسم

قفس کے بام و دَر میں روشنی سی آئی جاتی ہے
چمن میں آگیا شاید لبِ آزاد کا موسم

مرے شہرِ پریشاں مَیں تری بے چاند راتوں میں
بہت ہی یاد کرتا ہوں تری بُنیاد کا موسم

نہ کوئی غم خزاں کا ہے نہ خواہش ہے بہاروں کی
ہمارے ساتھ ہے امجد کسی کی یاد کا موسم



کہیں سنگ میں بھی ہے روشنی کہیں آگ میں بھی دُھواں نہیں
یہ عجیب شہرِ طلسم ہے! کہیں آدمی کا نشاں نہیں

نہ ہی اس زمیں کے نشیب میں نہ ہی آسماں کے فراز پر
کٹی عمر اُس کو تلاشتے، جو کہیں نہیں پہ کہاں نہیں؟

یہ جو زندگانی کا کھیل ہے، غم و انبساط کا میل ہے
اُسے قدر کیا ہو بہار کی! کبھی دیکھی جس نے خزاں نہیں

وہ جو کٹ گرے پہ نہ جُھک سکے جو نہ مقتلوں سے بھی رُک سکے
کوئی ایسا سر نہیں دوش پر، کسی مُنہ میں ایسی زباں نہیں

جو تھے اشک میں نے وہ پی لیے، لبِ خشک و سوختہ سی لیے
مرے زخم پھر بھی عیاں رہے، مرا درد پھر بھی نہاں نہیں

نہیں اس کو عشق سے واسطہ وہ ہے اور ہی کوئی راستہ
اگر اِس میں دِل کا لہو نہیں اگر اِس میں جاں کا زیاں نہیں

---



لبوں پہ پھول کھلتے ہیں کسی کے نام سے پہلے
دلوں کے دیپ جلتے ہیں، چراغِ شام سے پہلے

کبھی منظر بدلنے پر بھی قصّہ چل نہیں پاتا
کہانی ختم ہوتی ہے کبھی انجام سے پہلے

یہی تارے تمھاری آنکھ کی چلمن میں رہتے تھے
یہی سورج نکلتا تھا تمھارے بام سے، پہلے

دلوں کی جگمگاتی بستیاں تاراج کرتے ہیں،
یہی جو لوگ لگتے ہیں نہایت عام سے، پہلے

ہوئی ہے شام جنگل میں پرندے لوٹتے ہوں گے
اب اُن کو کس طرح روکیں، نواحِ دام سے پہلے

یہ سارے رنگ مُردہ تھے تمھاری شکل بننے تک
یہ سارے حرف مہمل تھے تمھارے نام سے پہلے

ہُوا ہے وہ اگر مُنصف تو امجدؔ احتیاطاً ہم
سزا تسلیم کرتے ہیں کسی الزام سے پہلے

---



خزاں کی دُھند میں لپٹے ہوئے ہیں
شجر مجبوریاں پہنے ہوئے ہیں
یہ کیسی فصلِ گُل آئی چمن میں
پرندے خوف سے سہمے ہوئے ہیں
ہواؤں میں عجب سی بے کلی ہے
دِلوں کے بادباں سمٹے ہُوئے ہیں
ہمارے خواب ہیں مکڑی کے جالے
ہم اپنے آپ میں اُلجھے ہُوئے ہیں
دمکتے، گنگناتے، موسموں کے
لہو میں ذائقے پھیلے ہُوئے ہیں

مری صُورت، زمیں کے سارے منظر
ترے دیدار کو ترسے ہُوئے ہیں

مثالِ نقشِ پا، حیران تیرے!
ہَوا کی راہ میں بیٹھے ہُوئے ہیں

نگاہوں سے کہو، ہم کو سمیٹیں
مری جاں، ہم بہت بکھرے ہُوئے ہیں

ادھوری خواہشوں کا غم نہ کرنا
کہ سارے خواب کب پُورے ہُوئے ہیں!

سمندر، آسماں اور سانس میرا
تری آواز پر ٹھہرے ہوئے ہیں

ہر اک رستے پہ کہتی ہیں یہ آنکھیں
یہ منظر تو کہیں دیکھے ہوئے ہیں!

ستارے آسماں کے، دیکھ امجد
کسی کی آنکھ میں اُترے ہُوئے ہیں

---



اشک آنکھوں میں آئے جاتے ہیں
پھر بھی ہم مُسکرائے جاتے ہیں

دشتِ بے سائباں میں، ہم تیری
یاد کے سائے سائے جاتے ہیں

کوئی سُنتا نہیں کسی کی بات
اپنی اپنی سُنائے جاتے ہیں

قصرِ شاہی سے کب رُکے وہ سوال!
جو سڑک پر اُٹھائے جاتے ہیں

ایسے جھکتی ہیں مہرباں آنکھیں
جیسے بادل سے چھائے جاتے ہیں

نہ سہی، زور گر ہوا پہ نہیں
ہم دیا تو جلائے جاتے ہیں

راستہ صاف ہو نہ ہو لیکن
ہم تو پتھر ہٹائے جاتے ہیں

ہم سُناتے ہیں حالِ دل اپنا
اور وہ مُسکرائے جاتے ہیں

پھیلتی جا رہی ہے تنہائی
شہر میں لوگ آئے جاتے ہیں

پردے میں ایک مُسکراہٹ کے
کتنے آنسو چھپائے جاتے ہیں

کون آیا ہے رُو برو امجد
آئنے جگمگائے جاتے ہیں

وہ دمکتی ہوئی لَو کہانی ہوئی وہ چمک دار شعلہ، فسانہ ہُوا
وہ جو اُلجھا تھا وحشی ہَوا سے کبھی، اُس دِیے کو بُجھے تو زمانہ ہُوا

ایک خوشبو سی پھیلی ہے چاروں طرف اُس کے امکان کی اُس کے اعلان کی
رابطہ پھر بھی اُس حُسنِ بے نام سے، جس کا جتنا ہوا، غائبانہ ہُوا

باغ میں پھُول اُس روز جو بھی کِھلا اُس کے بالوں میں سجنے کو بے چین تھا
جو ستارا بھی اُس رات روشن ہُوا، اُس کی آنکھوں کی جانب روانہ ہُوا

کہکشاں سے پرے آسماں سے پرے رہگزارِ زمان و مکاں سے پرے
مجھ کو ہر حال میں ڈھونڈنا تھا اُسے، یہ زمیں کا سفر تو بہانہ ہُوا



اب تو اُس کے دِنوں میں بہت دُور تک آسماں ہیں نئے اور نئی دُھوپ ہے
اب کہاں یاد ہوگی اُسے رات وہ، جس کو گزرے ہوئے اِک زمانہ ہُوا

موسمِ وصل میں خُوب ساماں ہوئے، ہم جو فصلِ بہاراں کے مہماں ہوئے
گھاس قالین کی طرح بچھتی گئی، سر بہ ابرِ رواں، شامیانہ ہُوا

اب تو امجد جُدائی کے اُس موڑ تک گرد کی دُھند ہے اور کچھ بھی نہیں
جانِ من، اب وہ دن لوٹنے کے نہیں، چھوڑیئے اب وہ قصّہ پرانا ہُوا

---



کسی کی دُھن میں جینا ہے، کسی کے ڈر میں رہنا ہے
بتا اے زِندگی کب تک اِسی چکّر میں رہنا ہے

دھنک بُنیاد تھی جن کی وہ بام و دَر نہ بن پائے
تذبذب نام ہے جس کا ہمیں اُس گھر میں رہنا ہے

تمنّا اور حسرت میں ہے فرق اظہار کا، یعنی
جو شعلہ جل نہیں سکتا اُسے پتھر میں رہنا ہے

ترے باغِ توجّہ کی فضا میں زندگی کرنا
رمِ خوشبو میں چلنا ہے گُلِ منظر میں رہنا ہے



کہانی ایک ہے لیکن، جُدا ہیں واقعے اپنے
تمہیں محشر اُٹھانا ہے ہمیں محشر میں رہنا ہے

تمنّا نے ہمیں پایا، تغافل اُن کو راس آیا
کہ ہر احساس کو امجد کسی پیکر میں رہنا ہے

---

کس قدر سلسلے نکل آئے
لرزشِ چشمِ نیم وا سے ہی

پھول سے رُت سے، باغباں سے نہیں
اپنا شکوہ تو ہے صبا سے ہی

رسم یہ حق پہ جان دینے کی
ہم نے سیکھی ہے کربلا سے ہی

خود جیئو، دُوسروں کو جینے دو
اپنی عادت ہے یہ سدا سے ہی

ہُنر و مرتبہ نہیں مخصوص
جُبّہ و خلعت و قبا سے ہی

کتنے ہی بے جہت نہ کیوں ہو جائیں!
اپنا رِشتہ تو ہے خُدا سے ہی

سینکڑوں بار مِل چکے ہوتے
آپ ملتے اگر دُعا سے ہی!



ایک احساسِ دِل کُشا سے ہی
کِھل اُٹھا دِل تری صدا سے ہی

مدّعا، حرفِ نارسائی کو
مِل گیا عرضِ مدّعا سے ہی

شاخ در شاخ زندگی جاگی
موسمِ سبز کی ہَوا سے ہی

دَرد کی آبرو نہیں رہتی
نیّتِ حرفِ التجا سے ہی
وہ دورا ہا بھی آگیا امجد
جس کا دھڑکا تھا ابتدا سے ہی

---



ہم تھے، ہمارے ساتھ کوئی تیسرا نہ تھا
ایسا حسین دن کہیں دیکھا سُنا نہ تھا

آنکھوں میں اُس کی تیر رہے تھے حیا کے رنگ
پلکیں اُٹھا کے میری طرف دیکھتا نہ تھا

کچھ ایسے اُس کی جھیل سی آنکھیں تھیں ہر طرف
ہم کو سوائے ڈوبنے کے راستہ نہ تھا

ہاتھوں میں دیر تک کوئی خوشبو بسی رہی
دروازۂ چمن تھا وہ بندِ قبا نہ تھا

اُس کے تو انگ انگ میں جلنے لگے دیے
جادُو ہے میرے ہاتھ میں مجھ کو پتا نہ تھا

اُس کے بدن کی لَو سے تھی کمرے میں روشنی
کھڑکی میں چاند، طاق میں کوئی دیا نہ تھا

کل رات وہ نگار ہُوا ایسا مُلتفت
عکسوں کے درمیان، کوئی آئنہ نہ تھا

سانسوں میں تھے گلاب تو ہونٹوں پہ چاندنی
ان منظروں سے میں تو کبھی آشنا نہ تھا

رویا کچھ اس طرح مرے شانے سے لگ کے وہ
ایسے لگا کہ جیسے کبھی بے وفا نہ تھا

ہے عشق ایک روگ، محبّت عذاب ہے
اِک روز یہ خراب کریں گے، کہا نہ تھا!

امجد وہاں پہ حد کوئی رہتی بھی کس طرح
رُکنے کو کہہ رہا تھا مگر روکتا نہ تھا

---

عُمرِ رواں کے رَخت میں ایسا نہیں کوئی
جو پَل تمھاری یاد سے باہر، بسر ہُوا

خوشبو تھی جو خیال میں، رزقِ اَلم ہُوئی
جو رنگِ اعتبار تھا، گردِ سفر ہُوا

دل کی گلی میں حدِّ نظر تک تھی روشنی
کرنیں سفیر، چاند ترا نامہ بر ہُوا

تارے مِرے وکیل تھے، خوشبو تری گواہ
کل شب عجب معاملہ، پیشِ نظر ہُوا

امجد اگر وہ دورِ جنوں جا چُکا، تو پھر
لہجے میں کیوں یہ فرق کسی نام پر ہُوا!

---

○

قاصد جو تھا بہار کا نا معتبر ہُوا
گلشن میں بندوبست برنگِ دِگر ہُوا

خواہش جو شاخِ حرف پہ چٹکی، بکھر گئی
آنسو جو دِل میں بند رہا، وہ گُہر ہُوا

اِک منحرف گواہ کی صُورت، چراغِ شام
اُس کی گلی میں رات مرا ہم سفر ہوا

آواز کیا کہ شکل بھی پہچانتا نہیں
غافل ہمارے حال سے وہ اِس قدر ہوا



ویرانۂ وجود میں چلنا پڑا ہمیں
اپنے لہو کی آگ میں جلنا پڑا ہمیں

منزل بہت ہی دُور تھی، رستے تھے اجنبی
تاروں کے ساتھ ساتھ نکلنا پڑا ہمیں

سایا مثال آئے تھے اُس کی گلی میں ہم
ڈھلنے لگی جو شام تو ڈھلنا پڑا ہمیں

اپنے کہے سے وہ جو ہوا منحرف، تو پھر
اپنا لکھا ہُوا بھی بدلنا پڑا ہمیں



محرابِ جاں کی شمعیں بچانے کے واسطے
ہر رات کُنجِ غم میں پگھلنا پڑا ہمیں

ہم چڑھتے سُورجوں کو سلامی نہ دے سکے
سُو دوپہر کی دھوپ میں جلنا پڑا ہمیں

تھا ابتدا سے علم کہ ہے راستہ غلط
اور قافلے کے ساتھ بھی چلنا پڑا ہمیں

شانے پہ اِس اَدا سے رکھا پھر کسی نے ہاتھ
دل مانتا نہ تھا پہ بہلنا پڑا ہمیں

امجد کسی طرف بھی سہارا نہ تھا کوئی
جب بھی گرے تو خود ہی سنبھلنا پڑا ہمیں

○

سرِ طاقِ جاں نہ چراغ ہے پسِ بامِ شب نہ سحر کوئی
عجب ایک عرصۂ درد ہے، نہ گمان ہے نہ خبر کوئی

نہیں اب تو کوئی ملال بھی کسی واپسی کا خیال بھی
غمِ بے کسی نے مٹا دیا مرے دل میں تھا بھی اگر کوئی

تجھے کیا خبر ہے کہ رات بھر تجھے دیکھ پانے کو اک نظر
رہا ساتھ چاند کے منتظر تری کھڑکیوں سے اُدھر کوئی

سرِ شاخِ جاں ترے نام کا عجب ایک تازہ گلاب تھا
جسے آندھیوں سے خطر نہ تھا جسے تھا خزاں کا نہ ڈر کوئی

تری بے رُخی کے دیار میں، گھنی تیرگی کے حصار میں
جلے کس طرح سے چراغِ جاں! کرے کس طرف کو سفر کوئی!

کٹے وقت چاہے عذاب میں کسی خواب میں یا سراب میں
جو نظر سے دُور نکل گیا اُسے یاد کرتا ہے ہر کوئی

سرِ بزم جتنے چراغ تھے وہ تمام رمز شناس تھے
تری چشمِ خوش کے لحاظ سے نہیں بولتا تھا مگر کوئی



شام بجھتی، چراغ جلتا رہا
قافلہ، زندگی کا چلتا رہا

شاد تھا رنجِ رہگزر میں کوئی!
کوئی منزل پہ ہاتھ ملتا رہا

دھوپ تھی جس نگر میں، کم نہ ہوئی
سایۂ آفتاب، ڈھلتا رہا

بجھ گئے تھے، دیے بھی، تارے بھی
اِک مرا خواب تھا کہ جلتا رہا



آئنے بھی نہ روک پائے اُسے
وقت کچھ اِس طرح سے چلتا رہا

بات کا رُخ کبھی، کبھی پہلو
ہجر کی شام وہ بدلتا رہا



ہر پل دھیان میں بسنے والے لوگ افسانے ہو جاتے ہیں
آنکھیں بوڑھی ہو جاتی ہیں خواب پرانے ہو جاتے ہیں

ساری بات تعلّق والی جذبوں کی سچّائی تک ہے
مَیل دِلوں میں آ جائے تو گھر ویرانے ہو جاتے ہیں

منظر منظر کِھل اُٹھتی ہے پیراہن کی قوسِ قزح
موسم تیرے ہنس پڑنے سے اور سہانے ہو جاتے ہیں

جھونپڑیوں میں ہر اک تلخی پیدا ہوتے مِل جاتی ہے
اِسی لیے تو وقت سے پہلے طفل سیانے ہو جاتے ہیں

وسم عشق کی آہٹ سے ہی ہر اک چیز بدل جاتی ہے
راتیں پاگل کر دیتی ہیں دن دیوانے ہو جاتے ہیں

دنیا کے اس شور نے امجد کیا کیا ہم سے چھین لیا ہے
ود سے بات کیے بھی اب تو کئی زمانے ہو جاتے ہیں

---



نہیں اب جہاں پہ نشان بھی
یہاں لوگ بھی تھے مکان بھی

مری آرزو میں جیئے گا وہ
مجھے کب تھا ایسا گمان بھی!

تری بے رُخی کے فشار سے
کبھی مل سکے گی امان بھی؟

اسی خاکداں کے حصار میں
مری خواہشوں کا جہان بھی

مری گمرہی کے غبار میں
مری منزلوں کے نشان بھی

عجب اُس کا رنگِ جمال ہے
کہ چمک اُٹھا ہے مکان بھی

عجب اُس حسیں کا خیال ہے
کہ مہک رہا ہے گمان بھی

اسی آسمان کی چھت تلے
مرا آشیاں بھی، اُڑان بھی

ترے اِک اشارے کے منتظر
یہ زمین بھی یہ زمان بھی

تری چشمِ خوش کی پناہ میں
مرے خواب بھی، مرے مان بھی

میں جہاں گیا مرے ساتھ تھی
مری عمر بھر کی تھکان بھی



کہیں بے کنار سے رتجگے، کہیں زرنگار سے خواب دے!
ترا کیا اُصول ہے زندگی؟ مجھے کون اس کا جواب دے!

جو چھپا سکوں ترے واسطے، جو سجا سکیں ترے راستے،
مری دسترس میں ستارے رکھ، مری مُٹھیوں کو گلاب دے

یہ جو خواہشوں کا پرند ہے، اسے موسموں سے غرض نہیں
یہ اُڑے گا اپنی ہی موج میں، اِسے آب دے کہ سراب دے!

تجھے چھُو لیا تو بھڑک اُٹھے مرے جسم و جاں میں چراغ سے
اِسی آگ میں مجھے راکھ کر، اسی شعلگی کو شباب دے

کبھی یوں بھی ہو ترے رُوبرو، میں نظر ملا کے یہ کہہ سکوں
"مری حسرتوں کو شمار کر، مری خواہشوں کا حساب دے!"

تری اِک نگاہ کے فیض سے مری کشتِ حرف چمک اُٹھے
مِرا لفظ لفظ ہو کہکشاں مجھے ایک ایسی کتاب دے"

---



ممکن نہیں تھا جو وہ ارادہ نہیں کیا
ہم نے تجھے بُھلانے کا وعدہ نہیں کیا

لہجے میں اُس کے رنگ تھا کم اعتماد کا
ہم نے بھی اعتبار زیادہ نہیں کیا

تھے مصلحت کی راہ میں سائے بہت گھنے
پر دل نے اختیار وہ جادہ نہیں کیا

جھولی میں ہم نے بھر لیے فاقے سمیٹ کر
دامن کسی کے آگے کشادہ نہیں کیا

تھے، خاکِ پائے اہلِ محبّت، مگر کبھی
سجدہ، بہ پیشِ تاج و لبادہ نہیں کیا

حرمت شناسِ درد تھے، سو ہم نے عُمر بھر
امجدؔ، حدیثِ جاں کا اعادہ نہیں کیا

---



بھنور میں کھو گئے ایک ایک کر کے ڈُوبنے والے
سرِ ساحل کھڑے تھے سب تماشا دیکھنے والے

خدا کا رزق تو ہرگز زمیں پر کم نہیں یارو!
مگر یہ کاٹنے والے! مگر یہ بانٹنے والے!

کہاں یہ عشق کا سنگِ گراں ہر اِک سے اُٹھتا ہے!
بہت سے لوگ تھے یوں تو یہ پتّھر چُومنے والے

وفا کی راہ مقتل سے گزرتی ہے تو بسم اللہ
نہیں پسپائی سے واقف تمہارے چاہنے والے

ازل سے ظلم دیکھے جا رہی ہیں، دیکھتی آنکھیں
ازل سے سوچ میں ڈوبے ہیں امجد، سوچنے والے



کوئی ہجر تھا نہ وصال تھا مرے سامنے
مری آرزوؤں کا جال تھا مرے سامنے

میں گرا ہوں کتنی ہی مرتبہ پہ رُکا نہیں
مگر ایک تیرا خیال تھا مرے سامنے

کسی آنکھ میں نہ تھی روشنی، کسی خواب کی
عجب ایک شہرِ ملال تھا مرے سامنے

لیے انگ میں پیاس سی، سرِ شام وہ
مری خواہشوں کی مثال تھا مرے سامنے

مجھے رات اپنی نگاہ پہ بھی یقیں نہ تھا
کوئی معجزوں سا کمال تھا مرے سامنے

سرِ بزم جب کسی آئینے پہ نظر پڑی
وہی ایک عکسِ جمال تھا مرے سامنے

وہی ایک چُپ کا غبار تھا پسِ چشمِ نم
وہی ایک تشنہ سوال تھا مرے سامنے!

○

جہاں کشتی رُکی میری کنارا اور تھا کوئی
جسے میں دوست سمجھا تھا ستارا اور تھا کوئی

فلک کی بالکونی میں خدا خاموش بیٹھا تھا
تو کیا اِن گرنے والوں کا سہارا اور تھا کوئی!

بجھی آنکھوں کے دامن میں جمی تھی دُھول برسوں کی
وہ چہرا اب جو دیکھا ہے دوبارا، اور تھا کوئی

بہت عادل سہی مُنصِف، مگر انصاف کیسے ہو!
گواہی اور ہے، قاتل ہمارا، اور تھا کوئی!

ہَوا کی سمت دیکھی اور کشتی ڈال دی ہم نے
کُھلا آکر سمندر میں اشارا اور تھا کوئی

فضا مہکی، چمن جاگا، اچانک کِھل اُٹھے تارے
کِسی کے مُسکراتے ہی نظارا اور تھا کوئی

وہی مانوس لہجہ تھا، وہی آواز تھی امجد
مگر جو مڑ کے دیکھا تو پکارا اور تھا کوئی

---



حد سے حد، حدِّ گماں تک کوئی جا سکتا ہے
ڈھونڈنے اُس کو کہاں تک کوئی جا سکتا ہے!

ہکشاں کون سی، اُس حُسن کے حلقے میں نہیں!
ہاں چلا جائے، جہاں تک کوئی جا سکتا ہے

کسی مانوس سے لہجے کا اِشارا مِل جائے
معجزہ ہائے بیاں تک کوئی جا سکتا ہے

کشتیٔ شوق ہے خطرے کے نشاں سے آگے
اور خطرے کے نشاں تک کوئی جا سکتا ہے

پھیلتے جاتے ہیں ہر سمت وہ اُڑتے گیسو
رات کے ساتھ کہاں تک کوئی جا سکتا ہے

مرتبہ میرا یہی ہے کہ زمیں زاد ہُوں میں
سو وہاں ہوں کہ جہاں تک کوئی جا سکتا ہے

راستے عشق کے آسان نہیں ہیں، امجد
ہاں مگر جاں کے زیاں تک کوئی جا سکتا ہے

---

○

زیرِ لب یہ جو تبسّم کا دِیا رکھا ہے
ہے کوئی بات جسے تم نے چھپا رکھا ہے

چند بے ربط سے صفحوں میں، کتابِ جاں کے
اِک نشانی کی طرح عہدِ وفا رکھا ہے

ایک ہی شکل نظر آتی ہے، جاگے، سوئے
تم نے جادُو سا کوئی مجھ پہ چلا رکھا ہے

یہ جو اِک خواب ہے آنکھوں میں نہفتہ مت پوچھ
کس طرح ہم نے زمانے سے بچا رکھا ہے!

کیسے خُوشبو کو بکھر جانے سے روکے کوئی!
رزقِ غنچہ اسی گٹھڑی میں بندھا رکھا ہے

کب سے احباب جِسے حلقہ کیے بیٹھے تھے
وہ چراغ آج سرِ راہِ ہَوا، رکھا ہے

دن میں سائے کی طرح ساتھ رہا، لشکرِ غم
رات نے اور ہی طوفان اُٹھا رکھا ہے

یاد بھی آتا نہیں اب کہ گلے تھے کیا کیا
سب کو اُس آنکھ نے باتوں میں لگا رکھّا ہے

دل میں خُوشبو کی طرح پھرتی ہیں یادیں، امجد
ہم نے اس دشت کو گلزار بنا رکھا ہے

---



○

ایک دن اِس طرح بھی ہونا ہے
رنگ کو روشنی میں کھونا ہے

جاگنا ہے غبار میں، ہم کو
خاک کی تیرگی میں سونا ہے

کتنی راتوں کو کر گیا جل تھل
ایک آنسو ابھی جو رونا ہے

عُمر کی قیدِ بامشقّت میں
جسم کا بوجھ ہم کو ڈھونا ہے

وقت اور بخت کے تعلّق میں
ایک بچّہ ہے اِک کھلونا ہے

تیری آنکھوں کے کُنج خوشبو میں
ہم کو بھی ایک خواب بونا ہے

اے مری چشمِ تر، بتا تو سہی
کون سا داغ ہے جو دھونا ہے!



تُو نہیں، تیرا استعارا نہیں
آسماں پر کوئی ستارا نہیں

وہ مرے سامنے سے گزُرا تھا
پھر بھی میں چُپ رہا، پکارا نہیں

وہ نہیں ملتا ایک بار ہمیں
اور یہ زندگی دوبارا نہیں

ہر سمندر کا ایک ساحل ہے
ہجر کی رات کا کنارا نہیں

ہو سکے تو نگاہ کر لینا
تم پہ کچھ زور تو ہمارا نہیں

ناؤ اُلٹی تو یہ ہُوا معلوم
زندگی موج ہے، کنارا نہیں!



مرنے کا ترے غم میں اِرادہ بھی نہیں ہے
ہے عشق مگر اِتنا زیادہ بھی نہیں ہے

ہے یُوں کہ عبارت کی زباں اور ہے کوئی
کاغذ مری تقدیر کا سادا بھی نہیں ہے

کیوں دیکھتے رہتے ہیں ستاروں کی طرف ہم!
جب اُن سے ملاقات کا وعدہ بھی نہیں ہے!

کیوں راہ کے منظر میں اُلجھ جاتی ہیں آنکھیں!
جب دل میں کوئی اور ارادہ بھی نہیں ہے!

کیوں اُس کی طرف دیکھ کے پاؤں نہیں اُٹھتے
وہ شخص حسیں اِتنا زیادہ بھی نہیں ہے

کِس موڑ پہ لے آیا ہمیں ہجرِ مُسلسل!
تا حدِّ نگہ وصل کا وعدہ بھی نہیں ہے

پتّھر کی طرح سرد ہے کیوں آنکھ کسی کی!
امجدؔ جو بچھڑنے کا ارادہ بھی نہیں ہے

---



دُور تلک ویرانہ ہے
کب تک چلتے جانا ہے!
آئینے کے ہاتھوں میں
مقتل کا پروانہ ہے
جانے والو، یاد رہے
شام ڈھلے گھر آنا ہے
فرق ہے کچھ کرداروں میں
باقی کھیل پرانا ہے

سچّی باتیں کون کرے

کون یہاں دیوانہ ہے!

تجھ سا دُوجا دیکھنے کو

سارا عالم چھانا ہے

مٹّی بھی ہے، سونا بھی

دل بھی عجب خزانہ ہے



مقتل میں بھی اہلِ جنوں ہیں کیسے غزل خواں، دیکھو تو!

ہم پہ پتّھر پھینکنے والو، اپنے گریباں، دیکھو تو!

ہم بھی اُڑائیں خاکِ بیاباں، دشت سے تم گزرو تو سہی

ہم بھی دکھائیں چاکِ گریباں، لیکن جاناں، دیکھو تو!

اے تعبیریں کرنے والو، ہستی مانا خواب سہی

اس کی رات میں جاگو تو، یہ خوابِ پریشاں دیکھو تو!

آج ستارے گُم صُم ہیں کیوں، چاند ہے کیوں سَودائی سا

آئینے سے بات کرو، اِس بھید کا عنواں دیکھو تو!

کس کے حُسن کی بستی ہے یہ! کس کے رُوپ کا میلہ ہے!
آنکھ اُٹھا اے حُسنِ زلیخا، یُوسفِ کنعاں، دیکھو تو
جو بھی علاجِ دردِ دلِ ہو، میں حاضر ہوں منظور مجھے
لیکن اِک شب امجد جی، وہ چہرۂ تاباں، دیکھو تو!



کس رات کی آنکھوں میں پیمانِ سحر ہو گا!
یہ خواب جو کونپل ہے، کس رُت میں شجر ہو گا!

آنچل کی ہوا رکھنا، تو اس کی بچا رکھنا
یہ شمع جدھر ہو گی، پروانہ اُدھر ہو گا

جب رات کے پردے سے پھر رات نکل آئے
اُس وقت کدھر جائے، جو اہلِ نظر ہو گا

تاریخ کے چکّر میں وہ موڑ نہیں آتا
جب شاد مکیں ہوں گے، آباد نگر ہو گا

بجھتے ہُوئے تاروں کی، جھلمل بھی غنیمت ہے
اِس ٹھہری ہُوئی شب میں کچھ وہم سفر ہوگا

افکار پہ پہرا ہے، قانون یہ ٹھہرا ہے
جو صاحب عزّت ہے وہ شہر بدر ہوگا

محسوس یہ ہوتا ہے، ہر جلتا ہُوا تارا
گزرے ہُوئے وقتوں میں اِک زخم ہنر ہوگا!

سہمے ہُوئے پنچھی کی آواز بتاتی ہے!
اُس کا بھی یہیں کوئی، جلتا ہُوا گھر ہوگا

○

☆

کون سی چیز دل کے بس میں نہیں
دل مگر اپنی دسترس میں نہیں

یہ تو ہم ہیں، جو خار و خس میں ہیں
منزلِ گُل تو خار و خس میں نہیں!

کب سے آنکھیں تلاشتی ہیں اُسے
ایک دن، جو کسی برس میں نہیں

جسم کتنی بڑی حقیقت ہو!
دل کی تسکیں مگر ہوس میں نہیں

کامراں ، عاشقی کی منزل میں
ہے وہی دل جو پیش وپس میں نہیں

دیکھ لی جنتری زمانے کی
وصل کا دن کسی برس میں نہیں

(ق)
نارسائی کی دُھند کے اُس پار
عشق میں کیا ہے؟ جو ہَوس میں نہیں!

لذّتِ پُرکشادگی کے سوا!
باغ میں کیا ہے؟ جو قفس میں نہیں!

---

○

پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجد ہم نے بچتے دیکھا کم

تاریکی کے ہاتھ پہ بیعت کرنے والوں کا
سُورج کی بس ایک کِرن سے گھُٹ جاتا ہے دَم

رنگوں کو کلیوں میں جینا کون سکھاتا ہے!
شبنم کیسے رُکنا سیکھی! تتلی کیسے رَم!

آنکھوں میں یہ پَلنے والے خواب نہ بجھنے پائیں،
دل کے چاند چراغ کی دیکھو، لَو نہ ہو مدّھم

ہنس پڑتا ہے بہت زیادہ غم میں بھی انساں
بہت خوشی سے بھی تو آنکھیں ہو جاتی ہیں نم!



ملے کیسے صدیوں کی پیاس اور پانی، ذرا پھر سے کہنا
بڑی دِلرُبا ہے یہ ساری کہانی، ذرا پھر سے کہنا

کہاں سے چلا تھا جُدائی کا سایا، نہیں دیکھ پایا
کہ رستے میں تھی آنسوؤں کی روانی، ذرا پھر سے کہنا

ہوا یہ خبر تُو سناتی رہے اور مَیں سُنتا رہوں
بدلنے کو ہے اَب یہ موسم خزانی، ذرا پھر سے کہنا

ٹکر جانے والا کبھی زندگی میں، خُوشی پھر نہ پائے
یُونہی ختم کرلیں، چلو یہ کہانی، ذرا پھر سے کہ

سَمے کے سمندر! کہا تُو نے جو بھی، سُنا، پر نہ سمجھ
جوانی کی ندّی، میں تھا تیز پانی، ذرا پھر سے کہ



گزرے ہیں ترے بعد بھی کچھ لوگ اِدھر سے
لیکن تری خوشبو نہ گئی، راہ گزر سے

کیوں ڈوبتی، بجھتی ہوئی آنکھوں میں ہے روشن
راتوں کو شکایت ہے تو اتنی ہے سحر سے!

لرزا تھا بدن اُس کا مرے ہاتھ سے چُھو کر
دیکھا تھا مجھے اُس نے عجب مست نظر سے

کیا ٹھان کے نکلا تھا، کہاں آ کے پڑا ہے!
پوچھے تو کوئی اس دلِ شرمندہ سفر سے

آیا ہے بہت دیر میں وہ شخص، پر اُس کو
جذبات کی اِس بھیڑ میں دیکھوں میں کدھر سے

ہم رزقِ گزرگاہ تو خاشاک تھے، لیکن!
وہ لوگ، جو نکلے تھے ہوا دیکھ کے گھر سے!

ایسا تو نہیں، میری طرح سروِ لبِ جُو!
قدموں پہ کھڑا ہو کسی اُفتاد کے ڈر سے

دن تھے کہ ہمیں شہرِ بدن تک کی خبر تھی
اور اب نہیں آگاہ تری خیر خبر سے

امجد نہ قدم روک کہ وہ دُور کی منزل
نکلے گی کسی روز اسی گردِ سفر سے

---



○

دریا کی ہوا تیز تھی، کشتی تھی پرانی
روکا تو بہت، دل نے مگر ایک نہ مانی

میں بھیگتی آنکھوں سے اُسے کیسے ہٹاؤں
مشکل ہے بہت ابر میں دیوار اُٹھانی

نکلا تھا تجھے ڈھونڈنے اک ہجر کا تارا
پھر اُس کے تعاقب میں گئی، ساری جوانی

کہنے کو نئی بات کوئی ہو تو سنائیں
سو بار زمانے نے سنی ہے یہ کہانی!

یہ پُل ہے یہاں پھُول کہاں، پچھلے برس کے
ہے دن تو وہی دوست، مگر اور ہے پانی

کس طرح مجھے ہوتا گماں، ترکِ وفا کا
آواز میں ٹھہراؤ تھا، لہجے میں روانی

اب میں اُسے قاتل کہوں امجدؔ کہ مسیحا
کیا زخم ہنر چھوڑ گیا، اپنی نشانی!

---

تری زد سے نکلنا چاہتا ہے
یہ دریا رُخ بدلنا چاہتا ہے

وہ سپنا، جس کی صورت ہی نہیں ہے
مری آنکھوں میں پلنا چاہتا ہے

دلوں کی ماندگی پہ کیا تعجب!
کہ سُورج بھی تو ڈھلنا چاہتا ہے

نشستِ درد بدلی ہے تو اب دل
ذرا پہلو بدلنا چاہتا ہے

ہُوا ہے بند اور شعلہ وفا کا
بہت ہی تیز جلنا چاہتا ہے

یہ دل اِس گرد بادِ زندگی میں
بس اِک لمحہ سنبھلنا چاہتا ہے

مجھے بھی سامنا ہے کربلا کا
مرا سر بھی اُچھلنا چاہتا ہے

نہیں ہیں ترجمانِ غم، یہ آنسو
یہ پانی اب اُبلنا چاہتا ہے

گزشتہ صحبتوں کا ایک لشکر
مرے ہمراہ چلنا چاہتا ہے

اُن آنکھوں کی ادا کہتی ہے امجد
کوئی پتھّر پگھلنا چاہتا ہے

---





چھیڑیں گے وہی قصّۂ غم اور طرح سے
لائیں گے تجھے راہ پہ ہم اور طرح سے

سجدے میں جبیں، سینے میں پندارِ خدائی!
اب آئے ہیں کعبے میں صنم اور طرح سے

ہوتا ہے گماں ان پہ کسی دستِ طلب کا
اب کھولے ہیں یاروں نے عَلَم اور طرح سے

ہے کام مساواتِ محمد کو مٹانا
کرتا ہے عرب اور، عجم اور طرح سے

ہم سوچتے رہتے ہیں عطا اور طرح کی
دیتا ہے ترا دستِ کرم اور طرح سے

مرتے تو شہیدانِ محبت بھی ہیں امجد
جاتے ہیں مگر سوئے عدم اور طرح سے



چہرے پہ مرے زُلف کو پھیلاؤ کسی دن
کیا روز گرجتے ہو، برس جاؤ کسی دن

رازوں کی طرح اُترو مرے دل میں کسی شب
دستک پہ مرے ہاتھ کی کھُل جاؤ، کسی دن

پیڑوں کی طرح حُسن کی بارش میں نہاؤں
بادل کی طرح جھوم کے گھِر آؤ کسی دن

خوشبو کی طرح گزرو مرے دل کی گلی سے
پھولوں کی طرح مجھ پہ بکھر جاؤ کسی دن

پھر ہاتھ کو خیرات ملے بندِ قبا کی
پھر لطفِ شبِ وصل کو دہراؤ کسی دن

گزریں جو مرے گھر سے تو رُک جائیں ستارے
اس طرح مری رات کو چمکاؤ کسی دن

میں اپنی ہر اک سانس اُسی رات کو دے دوں
سر رکھ کے مرے سینے پہ سو جاؤ، کسی دن



کوئی بھی آدمی پورا نہیں ہے
کہیں آنکھیں، کہیں چہرا نہیں ہے

یہاں سے کیوں کوئی بیگانہ گزرے!
یہ میرے خواب ہیں، رستہ نہیں ہے

جہاں پر تھے تری پلکوں کے سائے
وہاں اب کوئی بھی سایا نہیں ہے

زمانہ دیکھتا ہے ہر تماشہ
یہ لڑکا کھیل سے تھکتا نہیں ہے

ہزاروں شہر ہیں ہمراہ اس کے
مسافر دشت میں تنہا نہیں ہے

یہ کیسے خواب سے جاگی ہیں آنکھیں
کسی منظر پہ دل جمتا نہیں ہے

جو دیکھو تو ہر اک جانب، سمندر
مگر پینے کو اک قطرہ نہیں ہے

مثالِ چوبِ نم خوردہ، یہ سینہ
سُلگتا ہے، مگر جلتا نہیں ہے

خُدا کی ہے یہی پہچان، شاید
کہ کوئی اور اُس جیسا نہیں ہے

---





کہاں آ کے رُکنے تھے راستے! کہاں موڑ تھا! اُسے بھول جا
وہ جو مل گیا اُسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اُسے بھول جا

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دلِ بے خبر مری بات سُن، اُسے بھول جا، اُسے بھول جا

میں تو گُم تھا تیرے ہی دھیان میں، تری آس، تیرے گمان میں
صبا کہہ گئی مرے کان میں، میرے ساتھ آ، اُسے بھول جا

کسی آنکھ میں نہیں اشکِ غم، ترے بعد کچھ بھی نہیں ہے کم
تجھے زندگی نے بھلا دیا، تُو بھی مُسکرا، اُسے بھول جا

کہیں چاکِ جاں کا رفو نہیں، کسی آستیں پہ لہو نہیں
کہ شہیدِ راہِ ملال کا نہیں خوں بہا، اُسے بھول جا

کیوں اَٹا ہوا ہے غبار میں، غمِ زندگی کے فشار میں
وہ جو درج تھا ترے بخت میں، سو وہ ہو گیا، اُسے بھول جا

نہ وہ آنکھ ہی تری آنکھ تھی، نہ وہ خواب ہی ترا خواب تھا
دلِ منتظر تو یہ کس لیے، ترا جاگنا، اُسے بھول جا

یہ جو رات دن کا ہے کھیل سا، اسے دیکھ، اس پہ یقیں نہ کر
نہیں عکس کوئی بھی مستقل، سرِ آئنہ، اُسے بھول جا

جو بساطِ جاں ہی اُلٹ گیا، وہ جو راستے سے پلٹ گیا
اُسے روکنے سے حصول کیا، اُسے مت بُلا، اُسے بھول جا

تو یہ کس لیے شبِ ہجر کے اُسے ہر ستارے میں دیکھنا
وہ فلک کہ جس پہ ملے تھے ہم، کوئی اور تھا، اُسے بھول جا

تجھے چاند بن کے ملا تھا جو، ترے ساحلوں پہ کھلا تھا جو
وہ تھا ایک دریا وصال کا، سو اُتر گیا، اُسے بھول جا

---

اپنے گھر کی کھڑکی سے میں آسمان کو دیکھوں گا
جس پر تیرا نام لکھا ہے اُس تارے کو ڈھونڈوں گا

تم بھی ہر شب دیا جلا کر پلکوں کی دہلیز پہ رکھنا
میں بھی روز اک خواب تمھارے شہر کی جانب بھیجوں گا

ہجر کے دریا میں تم پڑھنا لہروں کی تحریریں بھی
پانی کی ہر سطر پہ میں کچھ دل کی باتیں لکھوں گا



جس تنہا سے پیڑ کے نیچے ہم بارش میں بھیگے تھے
تم بھی اُس کو چھو کے گزرنا، میں بھی اُس سے لپٹوں گا

"خواب مسافر لمحوں کے ہیں، ساتھ کہاں تک جائیں گے"
تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے، میں بھی اب کچھ سوچوں گا

بادل اوڑھ کے گزروں گا میں تیرے گھر کے آنگن سے
قوسِ قزح کے سب رنگوں میں تجھ کو بھیگا دیکھوں گا

رات گئے جب چاند ستارے لکن میٹی کھیلیں گے
آدھی نیند کا سپنا بن کر میں بھی تم کو چھو لوں گا

بے موسم بارش کی صورت، دیر تلک اور دور تلک
تیرے دیارِ حسن پہ میں بھی کِن مِن کِن مِن برسوں گا

شرم سے دوہرا ہو جائے گا کان پڑا وہ بُندا بھی
بادِ صبا کے لہجے میں اک بات میں ایسی پوچھوں گا

صفحہ صفحہ ایک کتابِ حُسن سی کُھلتی جائے گی
اور اُسی کی لَو میں پھر میں تُم کو اَزبر کر لُوں گا

وقت کے اِک کنکر نے جس کو عکسوں میں تقسیم کیا
آبِ رواں میں کیسے امجدؔ اب وہ چہرا جوڑوں گا!



بانجھ اِرادہ اور کوئی!
جُھوٹا وعدہ اور کوئی!

ہم جیسا کیا دیکھا ہے!
تم نے سادہ اور کوئی!

دل میں سارا کھوٹ ہی کھوٹ
تن پہ لبادہ اور کوئی

دیر و حَرم تو چھان لیے
دیکھیں جادہ ، اور کوئی!

دل میں اب کیوں رہتا ہے!
تم سے زیادہ اور کوئی!

نکلے تھے ہم اپنے گھر سے
کر کے ارادہ اور کوئی

آخر کس اُمید پہ مانگیں
امجد وعدہ اور کوئی!

---

شہد کہیں گے سَم کو بھی
جینا تو ہے ہم کو بھی!

تجھ بن جلتے دیکھا ہے
پھُولوں کے موسم کو بھی

بازاروں میں لے آئے
لوگ تو دل کے غم کو بھی!

مُہلت آنکھ جھپکنے کی
منظر کو بھی، ہم کو بھی

صدیوں پیچھے بھاگے گا
ٹھہرا جو اِک دَم کو بھی

قاصد کر کے دیکھیں گے
اب کے چشمِ نم کو بھی

کون یہ پیاسا گزرا ہے؟
توڑ کے جامِ جم کو بھی

مولا —— تیری دُنیا میں
چین ملے گا ہم کو بھی!

امجد اُونچا رکھیں گے
جلے ہُوئے پرچم کو بھی

---



وہ جو اُوپر ہے بیٹھا ہُوا، اور ہے
میری بستی کا شاید خُدا، اور ہے!

وصل کی شب تو چمکے تھے تارے بہت
ہجر کی شام کا سلسلہ اور ہے

شہر میں جو اُڑی وہ خبر، اور تھی
جس سے گزرے تھے ہم، واقعہ اور ہے

کر رہا ہُوں مُسلسل سفر کس لیے؟
اُس کی بستی کا تو راستہ اور ہے

خُود کو لگتے ہیں کیوں ، اجنبی ، اجنبی!
عکس بدلا ہے یا آئنہ اور ہے

ماند پڑتے ہُوئے منظروں کی قسم!
واپسی کے سفر کا مزا اور ہے

دردمندِ وفا، کس طرح سے رُکے
اس نگر کی تو آب و ہوا اور ہے

اپنے تاروں سے کہنا، چمکتے رہیں!
میری آنکھوں میں اِک رتجگا اور ہے

اَب تو ہے راکھ کی ایک مُٹھی، یہ دل
جو ہَوا سے لڑا تھا دِیا اور ہے!



ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، فرُصت کتنی ہے
پھر بھی تیرے دیوانوں کی شُہرت کتنی ہے!

سُورج گھر سے نِکل چُکا تھا کرنیں تیز کیے
شبنم گُل سے پُوچھ رہی تھی" مہلت کتنی ہے"!

بے مقصد سب لوگ مُسلسل بولتے رہتے ہیں
شہر میں دیکھو سنّاٹے کی دہشت کتنی ہے!

لفظ تو سب کے اِک جیسے ہیں، کیسے بات کھُلے؟
دُنیا داری کتنی ہے اور چاہت کتنی ہے!

سپنے بیچنے آ تو گئے ہو، لیکن دیکھ تو لو
دُنیا کے بازار میں ان کی قیمت کتنی ہے!

دیکھ غزالِ رم خُوردہ کی پھیلی آنکھوں میں
ہم کیسے بتلائیں دل میں وحشت کتنی ہے!

ایک ادھورا وعدہ اُس کا، ایک شکستہ دل،
لُٹ بھی گئی تو شہرِ وفا کی دولت کتنی ہے!

☆

میں ساحل ہُوں امجد اور وہ دریا جیسا ہے
کتنی دُوری ہے دونوں میں، قُربت کتنی ہے!

---



شمعِ غزل کی لَو بن جائے، ایسا مصرعہ ہو تو کہو
اِک اِک حرف میں سوچ کی خُوشبو، دل کا اُجالا ہو تو کہو

☆

رازِ محبت کہنے والے لوگ تو لاکھوں ملتے ہیں
رازِ محبت رکھنے والا، ہم سا دیکھا ہو تو کہو!

کون گواہی دے گا اُٹھ کر جھُوٹوں کی اس بستی میں
سچ کی قیمت دے سکنے کا تم میں یارا ہو تو کہو!

ویسے تو ہر شخص کے دل میں ایک کہانی ہوتی ہے
ہجر کا لاوا، غم کا سلیقہ، درد کا لہجہ ہو تو کہو

امجد صاحب آپ نے بھی تو دُنیا گھوم کے دیکھی ہے
ایسی آنکھیں ہیں تو بتاؤ! ایسا چہرا ہو تو کہو!



حضورِ یار میں حرف التجا کے رکھے تھے
چراغ سامنے جیسے ہَوا کے رکھے تھے

بس ایک اشکِ ندامت نے صاف کر ڈالے
وہ سب حساب جو ہم نے اُٹھا کے رکھے تھے

سمومِ وقت نے لہجے کو زخم زخم کیا
وگرنہ ہم نے قرینے صَبا کے رکھے تھے

تمھی نے پاؤں نہ رکھا وگرنہ وصل کی شب
زمیں پہ ہم نے ستارے بچھا کے رکھے تھے!

بکھر رہے تھے سو ہم نے اُٹھا لیے خُود ہی
گلاب جو تری خاطر سجا کے رکھے تھے

ہَوا کے پہلے ہی جھونکے سے ہار مان گئے
وہی چراغ جو ہم نے بچا کے رکھے تھے

مٹا سکی نہ انھیں روز و شب کی بارش بھی
دلوں پہ نقش جو رنگِ حنا کے رکھے تھے

حصولِ منزلِ دُنیا کچھ ایسا کام نہ تھا
مگر جو راہ میں پتھر اَنا کے رکھے تھے!

---

آگ لگی تھی سینہ سینہ، ہر شعلہ جوالا تھا
اب کے شہر میں روشنیوں کا منظر دیکھنے والا تھا!

دروازوں پر پڑے ہُوئے تھے ڈھیر شکستہ خوابوں کے
دالانوں میں نفرت کے آسیب نے ڈیرا ڈالا تھا

گلیوں گلیوں بھٹک رہا تھا ایک سُنہرا خواب، جسے
میرے بڑوں نے اپنی لاکھوں نیندیں بیچ کے پالا تھا

اپنی اپنی کشتی لے کر یوں دریا میں کُود پڑے
جیسے صرف جہاز ہی اس طوفان میں ڈوبنے والا تھا

امجدؔ یہ تقدیر تھی اُس کی یا قدرت کا کھیل!
گرا جہاں پر رات کا پنچھی، تھوڑی دُور اُجالا تھا

بھیڑ میں اِک اجنبی کا سامنا اچھّا لگا
سب سے چُھپ کر وہ کسی کا دیکھنا اچھّا لگا

سُرمئی آنکھوں کے نیچے پُھول سے کِھلنے لگے
کہتے کہتے کُچھ کسی کا سوچنا، اچھّا لگا

بات تو کچُھ بھی نہیں تھی لیکن اس کا ایک دَم
ہاتھ کو ہونٹوں پہ رکھ کر روکنا اچھّا لگا

چائے میں چینی مِلانا اُس گھڑی بھایا بہت
زیرِلب وہ مسکراتا "شکریہ" اچھا لگا

دل میں کتنے عہد باندھے تھے بُھلانے کے اُسے
وہ ملا تو سب ارادے توڑنا اچھا لگا

بے ارادہ لمس کی وہ سنسنی پیاری لگی
کم توجّہ آنکھ کا وہ دیکھنا اچھا لگا!

نیم شب کی خامشی میں، بھیگتی سڑکوں پہ کل
تیری یادوں کے جلو میں گھومنا اچھا لگا

اُس عدوئے جاں کو امجدؔ میں بُرا کیسے کہوں!
جب بھی آیا سامنے وہ بے وفا، اچھا لگا۔

---

○

ایک آزار ہُوئی جاتی ہے شُہرت ہم کو
خُود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فُرصت ہم کو

روشنی کا یہ مُسافر ہے، رہِ جاں کا نہیں!
اپنے سائے سے بھی ہونے لگی وحشت ہم کو

آنکھ اب کِس سے تحیّر کا تماشہ مانگے!
اپنے ہونے پہ بھی ہوتی نہیں حیرت ہم کو!

اب کے اُمّید کے شعلے سے بھی آنکھیں نہ جلیں
جانے کس موڑ پہ لے آئی محبّت ہم کو

کون سی رُت ہے زمانے میں، ہمیں کیا معلوم
اپنے دامن میں لیے پھرتی ہے حسرت ہم کو

زخم یہ وصل کے مرہم سے بھی شاید نہ بھرے
ہجر میں ایسی ملی اب کے مُسافت ہم کو

داغِ عصیاں تو کسی طور نہ چُھپتے امجد
ڈھانپ لیتی نہ اگر چادرِ رحمت ہم کو

---

شہر اُجڑا ہو تو آباد کروں!
جو نہ بھُولے اُسے کیا یاد کروں!

ساری چیزیں ہی بدل کر رہ جائیں
اِک ہُنر ایسا بھی ایجاد کروں

میرے لفظوں سے نکل جائے اثر
کوئی خواہش جو ترے بعد کروں

بھیک لعنت ہے! ملے یا نہ ملے
کیوں میں رُسوائیِ فریاد کروں!

کوئی اُس آنکھ پہ شاید اُترے!
روز اِک خواب کو آزاد کروں

یہ تو ہے کھیل کا حصّہ امجد
کس لیے شکوۂ بے داد کروں



جو اُتر کے زینۂ شام سے، تری چشمِ خُوش میں سما گئے
وُہی جلتے بجھتے چراغ سے، مرے بام و دَر کو سجا گئے

یہ جو عاشقی کا ہے سلسلہ، ہے یہ اصل میں کوئی معجزہ
کہ جو لفظ میرے گُماں میں تھے، وہ تری زبان پہ آ گئے!

وہ جو گیت تم نے سُنا نہیں، مری عُمر بھر کا ریاض تھا
مرے درد کی تھی وہ داستاں، جسے تم ہنسی میں اُڑا گئے

وہ چراغِ جاں، کبھی جس کی لَو، نہ کسی ہَوا سے نِگُوں ہُوئی
تری بے وفائی کے وسوسے اُسے چُپکے چُپکے بُجھا گئے

وہ تھا چاند شامِ وصال کا، کہ تھا رُوپ تیرے جمال کا
مری روح سے مری آنکھ تک، کسی روشنی میں نہا گئے

یہ جو بندگانِ نیاز ہیں، یہ تمام ہیں وہی لشکری!
جنھیں زندگی نے اماں نہ دی، تو ترے حضور میں آ گئے

تری بے رُخی کے دیار میں، میں ہَوا کے ساتھ ہَوا ہُوا
ترے آئنے کی تلاش میں، مرے خواب چہرا گنوا گئے

ترے وسوسوں کے فشار میں، ترا شہرِ رنگ اُجڑ گیا
مری خواہشوں کے غُبار میں، مرے ماہ و سالِ وفا گئے!

وہ عجیب پھُول سے لفظ تھے، ترے ہونٹ جن سے مہک اُٹھے
مرے دشتِ خواب میں دُور تک، کوئی باغ جیسے لگا گئے

مری عُمر سے نہ سمٹ سکے، مرے دل میں اتنے سوال تھے
ترے پاس جتنے جواب تھے، تری اِک نگاہ میں آ گئے

○

شکستہ لاکھ ہو نیّا کسی کی
نہیں سُنتا مگر دریا کسی کی

ضروری کیوں ہے زخمِ بے وفائی
گزُرتی کیوں نہیں، تنہا کسی کی!

کسی کے ساتھ سایا تک نہیں ہے
کسی کے ساتھ ہے دُنیا کسی کی

میں آنکھوں میں سجائے پھر رہا ہوں
نشانی ہے مرا صحرا کسی کی

پرانے ملگجے کپڑوں میں امجد
بڑھی کچھ اور بھی شوبھا کسی کی

منشار



غبارِ دشتِ طلب میں ہیں رفتگاں کیا کیا
چمک رہے ہیں اندھیرے میں استخواں کیا کیا

دکھا کے ہم کو ہمارا ہی فاش فاش بدن
دلاسے دیتے ہیں دیکھو تو قاتلاں کیا کیا

گھٹی دلوں کی محبت تو شہر بڑھنے لگے
مٹے جو گھر تو ہویدا ہوئے مکاں، کیا کیا

پلٹ کے دیکھا تو اپنے نشانِ پا بھی نہ تھے
ہمارے ساتھ سفر میں تھے ہمرہاں کیا کیا

ہلاکِ نالۂ شبنم، ذرا نظر تو اُٹھا
نمود کرتے ہیں عالم میں گُل رُخاں کیا کیا

کہیں ہے چاند سوالی، کہیں گدا خورشید
تمھارے در پر کھڑے ہیں یہ سائلاں کیا کیا

بچھڑ کے تجھ سے نہ جی پائے، مختصر یہ ہے
اس ایک بات سے نکلی ہے داستاں کیا کیا

ہے پُرسکون سمندر مگر سُنو تو سہی
لبِ خموش سے کہتے ہیں بادباں کیا کیا

کسی کا رختِ مسافت تمام دھوپ ہی دھوپ
کسی کے سر پہ کشیدہ ہیں سائباں کیا کیا

نکل ہی جائے گی اِک دن مدار سے یہ زمیں
اگرچہ پہرے پہ بیٹھے ہیں آسماں کیا کیا

فنا کی چال کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی
بساطِ دہر سے اُٹھے حساب داں کیا کیا

کسے خبر ہے کہ امجدؔ بہار آنے تک
خزاں نے چاٹ لیے ہوں گے گلستاں کیا کیا

---

منزل کی بے رُخی کے گلہ مند تھے ہمیں
ہر راستے میں سنگِ مجسّم بھی ہم ہی تھے

اپنی ہی آستیں میں تھا خنجر چھپا ہُوا
امجدؔ ہر ایک زخم کا مرہم بھی ہم ہی تھے



پسپا ہُوئی سپاہ تو پرچم بھی ہم ہی تھے
حیرت کی بات یہ ہے کہ برہم بھی ہم ہی تھے

گرنے لگے جو سُوکھ کے پتّے تو یہ کھُلا!
گلشن تھے ہم جو آپ تو موسم بھی ہم ہی تھے

ہم ہی تھے تیرے وصل سے محروم عُمر بھر
لیکن تیرے جمال کے محرم بھی ہم ہی تھے



کب سے ہم لوگ اِس بھنور میں ہیں!
اپنے گھر میں ہیں یا سفر میں ہیں!

یُوں تو اُڑنے کو آسماں ہیں بہت
ہم ہی آشوبِ بال و پر میں ہیں

زندگی کے تمام تر رستے
موت ہی کے عظیم ڈر میں ہیں

اِتنے خدشے نہیں ہیں رستوں میں
جس قدر خواہشِ سفر میں ہیں



سیپ اور جوہری کے سب رشتے
شعر اور شعر کے ہُنر میں ہیں

سایۂ راحتِ شجر سے نکل
کچھ اُڑانیں جو بال و پَر میں ہیں؟

عکس بے نقش ہو گئے امجدؔ
لوگ پھر آئنوں کے ڈر میں ہیں

---



(نذرِ مصحفی)

جب بھی آنکھوں میں ترے وصل کا لمحہ چمکا
چشمِ بے آب کی دہلیز پہ دریا چمکا

فصلِ گُل آئی، کھُلے باغ میں خُوشبو کے عَلَم
دِل کے ساحل پہ ترے نام کا تارا چمکا

عکس بے نقش ہُوئے آئنے دھندلانے لگے
درد کا چاند سرِ بامِ تمنّا چمکا



پیرہن میں بھی ترا حُسن نہ تھا برق سے کم
جب کھُلے بندِ قبا اور ہی نقشا چمکا

رُوح کی آنکھیں چکا چوند ہُوئی جاتی ہیں
کِس کی آہٹ کا مرے کان میں نغمہ چمکا

رنگ آزاد ہُوئے گُل کی گرہ کھُلتے ہی
ایک لمحے میں عجب باغ کا چہرا چمکا

دِل کی دیوار پہ اُڑتے رہے ملبُوس کے رنگ
دیر تک اِن میں تری یاد کا سایا چمکا

لہریں اُٹھ اُٹھ کے مگر اس کا بدن چُومتی تھیں
وہ جو دریا پہ گیا خُوب ہی دریا چمکا

یوں تو ہر رات چمکتے ہیں ستارے لیکن
وصل کی رات بہت صُبح کا تارا چمکا

ہجر پنپا نہ ترا وصل ہمیں راس آیا
کسی میدان میں تارا نہ ہمارا چمکا

جیسے بارش سے دُھلے صحنِ گلستاں امجدؔ
آنکھ جب خشک ہُوئی اور بھی چہرا چمکا



سائے ڈھلنے، چراغ جلنے لگے
لوگ اپنے گھروں کو چلنے لگے

اِتنی پُرپیچ ہے بھنور کی گرہ
جیسے نفرت دِلوں میں پلنے لگے

دُور ہونے لگی جرس کی صدا
کارواں، راستے بدلنے لگے

اُس کے لہجے میں برف تھی لیکن
چھُو کے دیکھا تو ہاتھ جلنے لگے

راہ گُم کردہ طائروں کی طرح
پھر ستارے سفر پہ چلنے لگے

پھر نگاہوں سے کٹ گئیں آنکھیں
عکس پھر آئنے بدلنے لگے

اُس کے بندِ قبا کے جادُو سے
سانپ سے اُنگلیوں میں چلنے لگے

---



پردے میں اُس بدن کے چُھپیں راز کس طرح !
خُوشبو نہ ہوگی پھُول کی غمّاز کس طرح !

طرزِ کلام اُن کا ہُوا طرزِ خاص و عام
بدلیں گے اَب وہ بات کا انداز کس طرح

بدلا جو اُس کی آنکھ کا انداز تو کھُلا !
کرتے ہیں رنگ پھُول سے پرواز کس طرح

(ق)

آنکھوں میں کیسے تن گئی دیوارِ بے حسی
سینوں میں گُھٹ کے رہ گئی آواز کِس طرح

وہ حق پرست کیسے ہُوئے مصلحت پرست؟
نغموں سے بے لباس ہُوئے ساز کِس طرح!

آنکھوں میں موم ڈال کے بیٹھیں گے کب تلک
آئینوں سے چھپائیں گے یہ راز کِس طرح!

اُس کی نظر میں عکسِ تعلّق کہیں نہیں
امجد، حدیثِ شوق ہو آغاز کِس طرح!

---

اپنے ہونے کی تب و تاب سے باہر نہ ہُوئے
ہم ہیں وہ سیپ جو آزادۂ گوہر نہ ہُوئے

حرفِ بے صَوت کی مانند رہے — دُنیا میں
دشتِ امکاں میں کِھلے نقشِ مصوّر نہ ہُوئے

پُھول کے رنگ سرِ شاخِ خزاں بھی چمکے
قیدیٔ رسمِ چمن، خاک کے جوہر نہ ہُوئے

تھک کے گرتے بھی نہیں، گھر کو پلٹتے بھی نہیں
نجمِ افلاک ہُوئے، آس کے طائر نہ ہُوئے

اس کی گلیوں میں رہے گردِ سفر کی صُورت
سنگِ منزل نہ بنے، راہ کا پتّھر نہ ہُوئے
اپنی ناکام اُمیدوں کے خم و پیچ میں گُم
ابرِکم آب تھے ہم، رزقِ سمندر نہ ہُوئے



لہُو کے پھُول سرِ شاخِ انتظار کھِلے
یہ کِس بہار کے غُنچے، پسِ بہار کھِلے!

دِلوں سے گردِ مُسافت دُھلی تو آنکھوں میں
گُلِ وصال کھِلے اور بے شُمار کھِلے

خود اپنے سامنے بے بس ہے قوّتِ تخلیق
کہ موجِ رنگ تو پتّھر کے آر پار کھِلے

ہے جو بھی پھول وہ فردِ حساب جیسا ہے
گئی رُتوں میں جو بوئے تھے اَب کی بار کھلے

ہوا کچھ ایسی چلی ہے سوادِ ہجراں میں
خزاں کے صحن میں جیسے گلِ بہار کھلے



لہو میں تیرتے پھرتے ملال سے کچھ ہیں
کبھی سنو تو دلوں میں سوال سے کچھ ہیں

میں خود بھی ڈوب رہا ہوں ہر اک ستارے میں
کہ یہ چراغ مرے حسبِ حال سے کچھ ہیں

غمِ فراق سے اک پل نظر نہیں ہٹتی
اس آئنے میں ترے خدوخال سے کچھ ہیں

اک اور موج کہ اے سیلِ اشتباہ ابھی
ہماری کشتِ یقیں میں خیال سے کچھ ہیں

ترے فراق کی صدیاں ترے وصال کے پل
شمارِ عمر میں یہ ماہ و سال سے کچھ ہیں





پلکوں کی دہلیز پہ چمکا ایک ستارا تھا
ساحل کی اُس بھیڑ میں جانے کون ہمارا تھا!

کہساروں کی گونج کی صورت پھیل گیا ہے وہ
میں نے اپنے آپ میں چھپ کر جسے پکارا تھا

سر سے گزرتی ہر اک موج کو ایسے دیکھتے ہیں
جیسے اِس گردابِ فنا میں یہی سہارا تھا!

ہجر کی شب وہ نیلی آنکھیں اور بھی نیلی تھیں
جیسے اُس نے اپنے سر سے بوجھ اُتارا تھا

جس کی جھلملتا میں تم نے، مجھ کو قتل کیا
پت جھڑ کی اُس رات وہ سب سے روشن تارا تھا

ترکِ وفا کے بعد مِلا تو، جب معلوم ہُوا
اِس میں کتنے رنگ تھے اس کے، کون ہمارا تھا

کون کہاں پر جھُوٹا نکلا! کیا بتلاتے ہم
دُنیا کی تفریح تھی اس میں، ہمیں خسارا تھا

جو منزل بھی راہ میں آئی، دل کا بوجھ بنی
وہ اُس کی تعبیر نہ تھی جو خواب ہمارا تھا

یہ کیسی آواز ہے جس کی زندہ گونج ہُوں میں
صبحِ ازل میں کس نے امجدؔ مجھے پکارا تھا

---





تارا تارا اُتر رہی ہے رات سمندر میں
جیسے ڈُوبنے والوں کے ہوں ہاتھ سمندر میں

ساحل پر تو سب کے ہونگے اپنے اپنے لوگ
رہ جائے گی کشتی کی ہر بات سمندر میں

ایک نظر دیکھا تھا اُس نے، آگے یاد نہیں
کھُل جاتی ہے دریا کی اوقات سمندر میں

میں ساحل سے لَوٹ آیا تھا، کشتی چلنے پر
پگھل چُکی تھی لیکن میری ذات سمندر میں

کاٹ رہا ہُوں ایسے امجدؔ یہ ہستی کی رہ
بے پتواری ناؤ پہ جیسے رات سمندر میں



لرزش نگہ میں، لہجے میں لُکنت عجیب تھی
اِس اوّلیں وصال کی وحشت عجیب تھی

روشن ہُوئی اُسی سے، اُسی سے بکھر گئی
شبنم کو آفتاب سے نسبت عجیب تھی

آنسو دیئے پر آنکھ کو رونے کی خُو نہ دی
اے بادشاہِ غم، یہ عنایت عجیب تھی

کھڑکی میں آکے چاند نے جھپکی نہیں پلک
کل شب مرے مکان میں صحبت عجیب تھی

اِک پَل تو جیسے سارا بدن سَنسنا اُٹھا
اِس سرسری نگاہ میں دعوت عجیب تھی

ساحل پہ تھے تو ریت کا جادُو تھا ہر طرف
کشتی چلی تو بحر کی دہشت عجیب تھی

دل میں نہ رہ سکے، جو کہیں تو کہی نہ جائے
امجد شکستِ دل کی حکایت عجیب تھی

○

دشتِ دل میں سراب تازہ ہیں
بُجھ چُکی آنکھ، خواب تازہ ہیں

داستانِ شکستِ دل ہے وُہی
ایک دو چار باب تازہ ہیں

کوئی موسم ہو دل گلستاں میں
آرزو کے گُلاب تازہ ہیں

دوستی کی زباں ہُوئی متروک
نفرتوں کے نصاب تازہ ہیں

آگہی کے، ہماری آنکھوں پر
جس قدر ہیں عذاب، تازہ ہیں

زخم در زخم دل کے کھاتے ہیں
دوستوں کے حساب تازہ ہیں

سر پہ بوڑھی زمین کے امجد
اب کے یہ آفتاب تازہ ہیں

○

جو سرِ دار آ نہیں سکتا
قرضِ ہستی چکا نہیں سکتا

"آج" جس آئینے میں دُھندلا ہو
عکس کل کا دِکھا نہیں سکتا

(ق)

لہر ایسی چلی ہے بستی میں
کوئی بھی سر اُٹھا نہیں سکتا

ضبط سے یوں چٹخ رہے ہونٹ
آدمی مُسکرا نہیں سکتا

زخمِ بے حُرمتی کی کیفیت
کوئی ہونٹوں پہ لا نہیں سکتا

اِتنی گہری ہُوئی ہے تاریکی
آدمی راہ پا نہیں سکتا

رات کے اِس حصار میں، مَیں تو
صُبح کے گیت گا نہیں سکتا

کِس قدر خواب ہیں نگاہوں میں
جن کو لفظوں میں لا نہیں سکتا

تم نہ دیکھو تمُھارا دین ایمان
میں تو نظریں چُرا نہیں سکتا

دِل سمندر بھی ہو اگر امجدؔ
پیاس غم کی بُجھا نہیں سکتا

---



اُس نے آہستہ سے جب پُکارا مجُھے
جُھک کے تکنے لگا ہر ستارا مجھے

تیرا غم، اِس فشارِ شب و روز میں
ہونے دیتا نہیں بے سہارا مجھے

ہر ستارے کی بُجھتی ہُوئی روشنی
میرے ہونے کا ہے استعارا مجُھے

اے خُدا، کوئی ایسا بھی ہے معجزہ
جو کہ مجھ پر کرے آشکارا مجھے

کوئی سُورج نہیں، کوئی تارا نہیں
تُو نے کس جھٹپٹے میں اُتارا مجھے!

عکسِ امروز میں، نقشِ دیروز میں
اِک اشارا تجھے، اِک اشارا مجھے

ہیں ازل تا ابد ٹوٹتے آئینے
آگہی نے کہاں لا کے مارا مجھے



لہُو میں رنگ لہرانے لگے ہیں
زمانے خُود کو دُہرانے لگے ہیں

پَروں میں لے کے بے حاصل اُڑانیں
پرندے لَوٹ کر آنے لگے ہیں

کہاں ہے قافلہ بادِ صبا کا!
دِلوں کے پھُول مُرجھانے لگے ہیں

کھُلے جو ہم نشینوں کے گریباں
خُود اپنے زخم افسانے لگے ہیں

کچھ ایسا درد تھا بانگِ جرس میں
سفر سے قبل پچھتانے لگے ہیں

کچھ ایسی بے یقینی تھی فضا میں
جو اپنے تھے وہ بیگانے لگے ہیں

ہوا کا رنگ نیلا ہو رہا ہے
چمن میں سانپ لہرانے لگے ہیں

فلک کے کھیت میں کھلتے ستارے
زمیں پر آگ برسانے لگے ہیں

لبِ زنجیر ہے تعبیر جن کی
وہ سپنے پھر نظر آنے لگے ہیں

کھلا ہے رات کا تاریک جنگل
اور اندھے راہ دکھلانے لگے ہیں

چمن کی باڑ تھی جن کا ٹھکانہ
دلِ شبنم کو دھڑکانے لگے ہیں

بچانے آئے تھے دیوار — لیکن
عمارت ہی کو اب ڈھانے لگے ہیں

خدا کا گھر تمھی سمجھو، تو سمجھو
ہمیں تو یہ صنم خانے لگے ہیں



اگرچہ کوئی بھی اندھا نہیں تھا
لکھا دیوار کا پڑھتا نہیں تھا

کچھ ایسی برف تھی اُس کی نظر میں!
گزرنے کے لیے رستہ نہیں تھا

تمھی نے کون سی اچھائی کی ہے
چلو مانا کہ میں اچھا نہیں تھا

کھلی آنکھوں سے ساری عمر دیکھا
اِک ایسا خواب جو اپنا نہیں تھا

میں اُس کی انجمن میں تھا اکیلا
کسی نے بھی مجھے دیکھا نہیں تھا

سحر کے وقت کیسے چھوڑ جاتا!
تمھاری یاد تھی، سپنا نہیں تھا

کھڑی تھی رات کھڑکی کے سرہانے
دریچے میں وہ چاند اُترا نہیں تھا

دلوں میں گرنے والے اشک چُنتا
کہیں اِک جوہری ایسا نہیں تھا

کچھ ایسی دھوپ تھی اُن کے سروں پر
خدا جیسے غریبوں کا، نہیں تھا

ابھی حرفوں میں رنگ آتے کہاں سے!
ابھی میں نے اُسے لکھا نہیں تھا

تھی پُوری شکل اُس کی یاد مجُھ کو
مگر میں نے اُسے دیکھا نہیں تھا

برہنہ خواب تھے سُورج کے نیچے
کسی اُمید کا پردا نہیں تھا

ہے امجدؔ آج تک وہ شخص دل میں
کہ جو اُس وقت بھی میرا نہیں تھا

---



جو آنسو دل میں گرتے ہیں وہ آنکھوں میں نہیں رہتے
بہت سے حرف ایسے ہیں جو لفظوں میں نہیں رہتے

کتابوں میں لکھے جاتے ہیں دُنیا بھر کے افسانے
مگر جن میں حقیقت ہو کتابوں میں نہیں رہتے

بہار آئے تو ہر اک پھُول پر اک ساتھ آتی ہے
ہوا جن کا مقدّر ہو وہ شاخوں میں نہیں رہتے

لیے پھرتے ہیں کچھ احباب ایسے مضطرب سجدے
جہاں در بار مل جائے جبینوں میں نہیں رہتے

مہک اور تتلیوں کا نام بھونرے سے جدا کیوں ہے
کہ یہ بھی تو خزاں آنے پہ پھولوں میں نہیں رہتے



کبھی تو دل تمناؤں کے اس گرداب سے نکلے
ہنر بھی کچھ ہمارے دیدۂ بے خواب سے نکلے!

ستارے ٹوٹ کر جیسے خلاؤں میں بکھر جائیں!
ہمارے نام بھی ایسے دلِ احباب سے نکلے

چمن میں گل بکھرنے پر بھی خوشبو چھوڑ جاتے ہیں!
زمیں کی انجمن سے جو اٹھے آداب سے نکلے

ابھی تک ان کے بام و در پہ امیدیں لرزتی ہیں
یہ کن شہروں کے نقشے وادیٔ سیلاب سے نکلے

محبت کا سخن وہ ہے کہ دشتِ سنگ میں کہیے
تو اِس کی بازگشتِ غم دلِ مہتاب سے نکلے

نہ ٹھہرا ایک بھی امجدؔ مری آنکھوں کے ساحل پر
ہزاروں کارواں اس رہگزارِ آب سے نکلے

---



کبھی رقصِ شامِ بہار میں اُسے دیکھتے
کبھی خواہشوں کے غبار میں اُسے دیکھتے

مگر ایک نجمِ سحر نما، کہیں جاگتا،
ترے ہجر کی شبِ تار میں اُسے دیکھتے

وہ تھا ایک عکسِ گریز پا، سو نہیں رُکا
کٹی عُمر دشت و دیار میں اُسے دیکھتے

وہ جو بزم میں رہا بے خبر، کوئی اور تھا
شبِ وصل میرے کنار میں اُسے دیکھتے

جو اَزل کی لوح پہ نقش تھا، وہی عکس تھا
کبھی آپ قریۂ دار میں اُسے دیکھتے

وہ جو کائنات کا نُور تھا، نہیں دُور تھا
مگر اپنے قُربِ وجود میں اُسے دیکھتے

یہی اب جو ہے یہاں نغمہ خواں، یہی خُوش بیاں
کسی شام کُوئے نگار میں اُسے دیکھتے

---



کسی کی آنکھ میں خُود کو تلاش کرنا ہے
پھر اس کے بعد ہمیں آئنوں سے ڈرنا ہے

فلک کی بند گلی کے فقیر ہیں تارے!
کہ گھوم پھر کے یہیں سے انھیں گزرنا ہے

جو زندگی تھی مری جان! تیرے ساتھ گئی
بس اب تو عُمر کے نقشے میں وقت بھرنا ہے

جو تم چلو تو ابھی دو قدم میں کٹ جائے
جو فاصلہ مجھے صدیوں میں پار کرنا ہے

تو کیوں نہ آج یہیں پر قیام ہو جائے
کہ شب قریب ہے، آخر کہیں ٹھہرنا ہے

وہ میرا سیلِ طلب ہو کہ تیری رعنائی
چڑھا ہے جو بھی سمندر، اُسے اُترنا ہے

سحر ہُوئی تو ستاروں نے مُوند لیں آنکھیں
وہ کیا کریں کہ جنھیں انتظار کرنا ہے

یہ خواب ہے کہ حقیقت، خبر نہیں امجد
مگر ہے جینا یہیں پر، یہیں پہ مرنا ہے

---

○

زندگانی ، جاودانی بھی نہیں
لیکن اس کا کوئی ثانی بھی نہیں

ہے سوا نیزے پہ سُورج کا عَلم
تیرے غم کی سائبانی بھی نہیں

منزلیں ہی منزلیں ہیں ہر طرف
راستے کی اِک نشانی بھی نہیں

آئنے کی آنکھ میں اَب کے برس
کوئی عکسِ مہربانی بھی نہیں

آنکھ بھی اپنی سراب آلود ہے
اور اِس دریا میں پانی بھی نہیں

جُز تحیّر، گردبادِ زیست میں
کوئی منظر غیر فانی بھی نہیں

درد کو دلکش بنائیں کس طرح!
داستانِ غم، کہانی بھی نہیں

یوں لُٹا ہے گلشنِ وہم و گماں
کوئی خارِ بدگمانی بھی نہیں

---



زندگی دَرد بھی، دَوا بھی تھی
ہم سفر بھی، گریز پا بھی تھی

کچھ تو تھے دوست بھی وفا شعار
کچھ مری آنکھ میں حیا بھی تھی

دن کا اپنا بھی شور تھا لیکن
شب کی آواز بے صدا بھی تھی

عشق نے ہم کو غیب دان کیا
یہی تحفہ، یہی سزا بھی تھی

گرد بادِ وفا سے پہلے تک
سر پہ خیمہ بھی تھا رِدا بھی تھی

ماں کی آنکھیں چراغ تھیں جس میں
میرے ہمراہ وہ دُعا بھی تھی

کچھ تو تھی رہگزر میں شمعِ طلب
اور کچھ تیز وہ ہَوا بھی تھی

بے وفا تو وہ خیر تھا امجدؔ
کیا اُس میں کہیں وفا بھی تھی!

---



آنکھوں سے اِک خواب گزرنے والا ہے
کھڑکی سے مہتاب گزرنے والا ہے

صدیوں کے ان خواب گزیدہ شہروں سے
مہرِ عالم تاب گزرنے والا ہے

جادوگر کی قید میں تھے جب شہزادے
قصّے کا وہ باب گزرنے والا ہے

(ق)

سنّاٹے کی دہشت بڑھتی جاتی ہے
بستی سے سیلاب گزرنے والا ہے

دریاؤں میں ریت اُڑے گی صحرا کی
صحرا سے گرداب گزرنے والا ہے

مولا جانے کب دیکھیں گے، آنکھوں سے
جو موسم شاداب گزرنے والا ہے

ہستی امجدؔ دیوانے کا خواب سہی
اب تو یہ بھی خواب گزرنے والا ہے

---



وہ بادِ شام تھا اُس کو گزر ہی جانا تھا
گُلِ اُمید کھِلا تھا، بکھر ہی جانا تھا

زمیں کا رزق ہُوئے وصل و انتظار کے رنگ
پسِ بہار یہ نشّہ اُتر ہی جانا تھا

ہر اک سفر کی حدوں پر تھا ایک اور سفر
تمھارا ساتھ نہ ملتا تو مر ہی جانا تھا

وہ ایسے ناز سے گزرا کہ میں بُلا نہ سکا
یہ اور بات مجھے بھی اُدھر ہی جانا تھا

سفر کی اوّلیں شب میں گریز کر جاتا
اُسے یہ ہاتھ اگر چھوڑ کر ہی جانا تھا

وفا کے باب میں لفظوں کے سلسلے تھے بہت
کہیں کسی کو مری جاں، مُکر ہی جانا تھا

اُفق کے ہاتھ پہ تاروں کا خُون تھا امجد
مَیں کورچشم اُسے بھی سحر ہی جانا تھا

۱۹۷۷ء



## (نذرِ اقبال)

ہُجومِ صید میں دیکھا گھِرا ہُوا صیّاد
بدل رہا ہے نیا رُوپ عالمِ ایجاد

تُمھاری میری محبّت بحال کیسے ہو!
تغیّرات پہ قائم ہے وقت کی بنیاد

جب اپنی آنکھ کا دیکھا نہ معتبر ٹھہرے
کہاں سے لائیں خیالوں کے واسطے اُسناد

وہ کیا گھڑی تھی، کہاں پر ملے تھے ہم دونوں
وہ چل دیا تو مجھے دیر تک نہ آیا یاد

مرا بدن تھا گھنے جنگلوں کی تاریکی
تری طلب نے کیا ہے یہ خاکداں آباد

میں اپنے ہست کی تنہائیوں میں روتا ہُوں
یہ مُسکراتا ہُوا شخص ہے مرا ہمزاد

جو بستیاں تھیں اُنھیں تو مٹا چکے امجدؔ
نجانے اب یہ خرابے کرے گا کون آباد!

۱۹۷۷ء

○

کہنے کو میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں
امجدؔ مگر وہ شخص مجھے بھولتا نہیں

ڈرتا ہُوں آنکھ کھولوں تو منظر بدل نہ جائے
مَیں جاگ تو رہا ہُوں مگر جاگتا نہیں

آشفتگی سے اُس کی اُسے بے وفا نہ جان
عادت کی بات اور ہے دِل کا بُرا نہیں

صاحبِ نظر سے کرتا ہے پتھر بھی گُفتگو
ناجنس کے حضور زباں کھولتا نہیں

تنہا اُداس چاند کو سمجھو نہ بے خبر
ہر بات سُن رہا ہے مگر بولتا نہیں

خاموش رتجگوں کا دُھواں تھا چہار سُو
نِکلا کب آفتاب مجھے تو پتا نہیں!

امجد وہ آنکھیں جھیل سی گہری تو ہیں مگر
اُن میں کوئی بھی عکس مِرے نام کا نہیں

۱۹۷۷ء

نعرہ نہیں تو نالہ ہی کوئی بُلند ہو
اے ساکنانِ شہرِ ستمگار کچھ کہو

کٹتی ہے کس طرح سے شبِ تارِ بے حسی
کرتے ہو بند کس طرح سُورج کی آنکھ کو!

سہمے ہُوئے ہیں اپنی ہی خاموشیوں سے لوگ
مُردہ نہیں یہ شہر مگر تُم صدا تو دو!

کیوں ہاتھ باندھے بیٹھے رہو مُجرموں کی مثل
دستِ ستم شعار سے تلوار چھین لو

امجدؔ یہ رَتجگے ہیں سزا خوابِ مَست کی
تاروں کے سائبان تلے جاگتے رہو

۱۹۷۷ء



کِسی کی آنکھ جو پُرنم نہیں ہے
نہ سمجھو یہ کہ اُس کو غم نہیں ہے

سوادِ دَرد میں تنہا کھڑا ہُوں!
پلٹ جاؤں مگر موسم نہیں ہے

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کِسی کی!
اگرچہ گُفتگو مُبہم نہیں ہے

سُلگتا کیوں نہیں تاریک جنگل!
طلب کی لَو اگر مدھم نہیں ہے

یہ بستی ہے ستم پروردگاں کی
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

کنارا دوسرا دریا کا جیسے
وہ ساتھی ہے مگر محرم نہیں ہے

دلوں کی روشنی بجھنے نہ دینا
وجودِ تیرگی محکم نہیں ہے

میں تم کو چاہ کر پچھتا رہا ہوں
کوئی اس زخم کا مرہم نہیں ہے

جو کوئی سن سکے امجد تو دنیا
بجز اک بازگشتِ غم نہیں ہے

۱۹۷۷ء



تلاشِ منزلِ جاناں تو اک بہانہ تھا
تمام عمر میں اپنی طرف روانہ تھا

میں تیری دھن میں رواں تھا مجھے پتہ نہ چلا
غبارِ راہ میں شاملِ غمِ زمانہ تھا

میں اُس کو حشر میں کس نام سے صدا دیتا
کہ میرا اُس کا تعارف تو غائبانہ تھا

عجب کشش تھی سمندر کی سبز آنکھوں میں
ہر ایک چشمہ اُسی کی طرف روانہ تھا

وہی نہیں تو ورق کس لیے سیاہ کریں
سخن تو عرضِ تمنّا کا اِک بہانہ تھا
سمندِ شوق تھا امجدؔ رواں دواں جب تک
قدم کے نیچے ستاروں کا شامیانہ تھا

۱۹۷۷ء



بستیوں میں اک صدائے بے صدا رہ جائے گی
بام و دَر پہ نقشِ تحریرِ ہوا رہ جائے گی

آنسوؤں کا رِزق ہوں گی بے نتیجہ چاہتیں
خُشک ہونٹوں پر لرزتی اِک دُعا رہ جائے گی

رُو برو منظر نہ ہوں تو آئنے کس کام کے
ہم نہیں ہوں گے تو دُنیا گردِ پا رہ جائے گی

خواب کے نشّے میں جُھکتی جائے گی چشمِ قمر
رات کی آنکھوں میں پھیلی التجا رہ جائے گی

بے ثمر پیڑوں کو چُومیں گے صبا کے سبز لب
دیکھ لینا، یہ خزاں بے دست و پا رہ جائے گی!

۱۹۷۶ء



تم سے بچھڑ کر پہروں سوچا رہتا ہُوں
اَب میں کیوں اور کس کی خاطر زندہ ہُوں
اَے خاموش خلا کے مالک تیری قسم
بزمِ جہاں میں تجھ سے زیادہ تنہا ہُوں
جیتی جاگتی دُنیا کے ہنگاموں میں
یوں لگتا ہے جیسے میں اِک سایا ہُوں
کھویا ہے وہ جیسے ہاتھ لکیروں میں
ایسے اپنے ہاتھ کو تکتا رہتا ہُوں

ریزہ ریزہ ٹوٹ چکا ہوں اندر سے
گھر سے باہر گردن تان کے چلتا ہوں
جانے جس کا نام ہے امجد، کون ہے وہ
سچ پوچھو تو میں اِک جھوٹا چہرہ ہوں



۱۹۷۶ء

دل کے دریا کو کسی روز اُتر جانا ہے
اِتنا بے سمت نہ چل، لَوٹ کے گھر جانا ہے
اُس تک آتی ہے تو ہر چیز ٹھہر جاتی ہے
جیسے پانا ہی اسے اصل میں مر جانا ہے
بول اے شامِ سفر، رنگِ رہائی کیا ہے؟
دل کو رُکنا ہے کہ تاروں کو ٹھہر جانا ہے!
کون اُبھرتے ہُوئے مہتاب کا رستہ روکے
اس کو ہر طور سُوئے دشتِ سحر جانا ہے

میں کھلا ہوں تو اسی خاک میں ملنا ہے مجھے
وہ تو خوشبو ہے اسے اگلے نگر جانا ہے

وہ ترے حسن کا جادو ہو کہ میرا غمِ دل
ہر مسافر کو کسی گھاٹ اُتر جانا ہے

۱۹۷۵ء



دِل میں لاوا اُبل رہا ہے کیا؟
کوئی کہسار جل رہا ہے کیا؟

خوابِ فردا! زمیں پہ ظاہر ہو
میری آنکھوں میں پل رہا ہے کیا!

چشمِ شبنم — سفیرِ غنچہ بن
یوں ہوا بن کے چل رہا ہے کیا!

آ شریکِ غمِ خدائی ہو
اپنی وحدت میں گل رہا ہے کیا!

اِتنے آسودہ کیوں ہیں اہلِ سفر
سر سے طُوفان ٹل رہا ہے کیا؟

کِس لیے بدحواس ہیں تارے
کوئی سُورج نِکل رہا ہے کیا؟

کیوں ہَوا اس قدر رُکی سی ہے
کوئی طوفان پَل رہا ہے کیا؟

کاٹ کر پھینک دے انھیں امجدؔ
ایسے ہاتھوں کو مل رہا ہے کیا!

۱۹۷۵ء

O

اب کے سَفر ہی اور تھا، اور ہی کچُھ سراب تھے
دشتِ طلب میں جا بجا، سنگِ گرانِ خواب تھے

حشر کے دن کا غلغلہ، شہر کے بام و دَر میں تھا
نِگلے ہُوئے سوال تھے، اُگلے ہُوئے جواب تھے

اب کے برس بہار کی، رُت بھی تھی اِنتظار کی
لہجوں میں سیلِ دَرد تھا، آنکھوں میں اضطراب تھے

خوابوں کے چاند ڈھل گئے تاروں کے دم نِکل گئے
پُھولوں کے ہاتھ جل گئے، کیسے یہ آفتاب تھے!

سیل کی رہگزر ہوئے، ہونٹ نہ پھر بھی تر ہوئے
کیسی عجیب پیاس تھی، کیسے عجب سحاب تھے!

عمر اسی تضاد میں، رزقِ غبار ہو گئی
جسم تھا اور عذاب تھے، آنکھیں تھیں اور خواب تھے

صبح ہوئی تو شہر کے شور میں یوں بکھر گئے
جیسے وہ آدمی نہ تھے، نقش و نگارِ آب تھے

آنکھوں میں خون بھر گئے، رستوں میں ہی بکھر گئے
آنے سے قبل مر گئے، ایسے بھی انقلاب تھے

ساتھ وہ ایک رات کا، چشمِ زدن کی بات تھا
پھر نہ وہ التفات تھا، پھر نہ وہ اجتناب تھے

ربط کی بات اور ہے، ضبط کی بات اور ہے
یہ جو فشارِ خاک ہے، اِس میں کبھی گلاب تھے

ابر برس کے کھل گئے، جی کے غبار دھل گئے
آنکھ میں رونما ہوئے، شہر جو زیرِ آب تھے

درد کی رہگزار میں، چلتے تو کس خمار میں
چشم کہ بے نگاہ تھی، ہونٹ کہ بے خطاب تھے

۱۹۷۵ء



شبِ فراق کی خوشبو غروبِ شام میں تھی
زمین دنگ، ستاروں کے ازدحام میں تھی

ہمیں خود اپنے تجسس سے ہیں گلے کیا کیا
وہ بات اُس میں نہیں تھی جو اُس کے نام میں تھی

تجھے تلاشنا جیسے اُفق کو چھونا تھا!
وہی سفر میں تھی حالت کہ جو قیام میں تھی

نگاہِ خاص جو ہوتی تو دیکھتا کوئی
وہ ایک بات جو تیری نگاہِ عام میں تھی

تمام رنگ اُڑے جا رہے تھے اُس کی طرف
عجب طرح کی کشش آفتابِ شام میں تھی

چمک رہا تھا ہواؤں کی آستیں پہ لہو
اِدھر زمین بہاروں کے اہتمام میں تھی

یہ کس نے لوٹ لیے قافلے ستاروں کے
سحر کی تیغ تو امجد ابھی نیام میں تھی

۱۹۷۵ء



کِس قدر زخم زخم چہرا ہے
چاند بھی آدمی سا لگتا ہے

اِس کے دل میں بھی چور ہے شاید!
وہ بھی نظریں جُھکا کے گزُرا ہے

اِس طرف میں ہُوں اُس طرف تُم ہو
بیچ میں زندگی کا میلا ہے

زر کی افراط ہوگئی ہے بہت
ہر گھڑی دِل کا بھاؤ گرتا ہے

جیسے سچ مُچ اُسے بہت غم ہو
اِس طرح اُس نے حال پُوچھا ہے

اِس قدر مہربان ہے دُنیا
زندہ رہنا عذاب لگتا ہے

تم نے اچھّا کیا جو لَوٹ آئے
بارشوں کے سفر میں خطرہ ہے

(ق)

اِس قدر قرض ہے محبّت کا
سوچتا ہُوں تو ہول اُٹھتا ہے

عشق کے واجبات کیسے دُوں!
تم نے کیا میرے پاس چھوڑا ہے

(ق)

اِتنے مصروف ہو گئے ہیں ہم
وقت ٹھہرا ہُوا سا لگتا ہے

آرزو، ماورائے وقت نہیں
مل بھی جاؤ اگر، تو اَب کیا ہے!

---

کٹ کے نخلِ فلک سے اے امجدؔ
تارا کِھلتا ہے یا بکھرتا ہے؟

۱۹۷۵ء

○

گُزر گیا جو زمانہ اُسے بُھلا ہی دو
جو نقش بن نہیں سکتا اُسے مِٹا ہی دو

کُھلے گا ترکِ تعلّق کے بعد بابِ فنا
یہ ایک آخری پردہ بھی اَب اُٹھا ہی دو

رُکی رُکی سی ہَوا ہے تھکا تھکا ہے چاند
وفا کے دشت میں حیراں کھڑے ہیں راہی دو

گُزر رہا ہے جو لمحہ اسے امر کر لیں
میں اپنے خُون سے لکھتا ہُوں، تم گواہی دو

کسی طرح سے تغافل کا بابِ تنگ تو کھلے
نہیں میں پیار کے قابل تو کچھ سزا ہی دو
میں کائنات کو غم سے نجات دے دوں گا
مری گرفت میں اِک دِن اگر تباہی دو

۱۹۷۴ء



رواں دواں ہے سفر، پیش و پس نہیں معلوم
قفس میں رہتے ہیں، حدِ قفس نہیں معلوم

ملوں تو تا بہ اَبد اس کو چُومنا چاہوں
کہاں بچھڑتے ہیں عشق و ہوس، نہیں معلوم

سکوتِ شام میں زنجیر سی چھنکتی ہے
یہ سانس ہے کہ صدائے جرس، نہیں معلوم

نشاطِ وصل کا لمحہ عجیب لمحہ تھا
کہاں رہا ہُوں میں اِتنے برس، نہیں معلوم

زمیں کی قید میں مَیں ہُوں یہ میری قید میں ہے
کہاں پہ گھر ہے، کہاں ہے قفس، نہیں معلُوم!

زمیں کے رنگ تھے جتنے، فنا پذیر ہُوئے
جلی ہے کس لیے شمعِ نفس، نہیں معلُوم

ٹپک رہا ہے سماعت میں کچُھ نہ کچُھ امجد
غمِ حیات کا سَم ہے کہ رَس، نہیں معلُوم

۱۹۷۴ء

وہی ہے دَرد کا عالم اُسے بُھلا کر بھی
مرے قریب ہی نکلا وہ دُور جا کر بھی

پیئے ہیں سات سمندر مگر وُہی ہے پیاس
نگاہ بھرتی نہیں ہے کسی کو پا کر بھی

الگ الگ سہی دُنیا کا اور دوست کا غم
کبھی یُونہی ذرا دیکھو انھیں ملا کر بھی

عجیب قحط پڑا اَب کے سال اَشکوں کا
کہ آنکھ تر نہ ہُوئی خُون میں نہا کر بھی

ہر ایک شے تری رحمت کے گیت گاتی ہے
اگر ہے سچ تو کبھی اے مرے خدا، کر بھی

فنا کا عکس ہے شبنم میں، گُل کا عکس نہیں
نگاہ کر کبھی اِس آئینے میں آ کر بھی

زمیں کا سانس رُکا ہے ترے اشارے پر
کبھی تو دیکھ اِدھر اِک نظر اُٹھا کر بھی

بگولے رقص کو اُٹھے، ہَوا نے تالی دی
سکون مل نہ سکا بستیوں سے جا کر بھی

ہر ایک قید کی کوئی اخیر ہے امجد
نفس کو خاک کے جادو سے اَب رِہا، کر بھی!

۱۹۷۴ء



رُتوں کے ساتھ دِلوں کی وہ حالتیں بھی گئیں
ہَوا کے سَنگ ہَوا کی امانتیں بھی گئیں

ترے لکھے ہُوئے لفظوں کی راکھ کیا چھیڑیں
ہمارے اپنے قلم کی صداقتیں بھی گئیں

جو آئے جی میں پُکارو مجھے، مگر ہے یُوں
کہ اُس کے ساتھ ہی اُس کی محبّتیں بھی گئیں

عجیب موڑ پہ ٹھہرا ہے قافلہ دِل کا
سکون ڈھونڈنے نکلے تھے وحشتیں بھی گئیں

یہ کیسی نیند میں ڈوبے ہیں آدمی امجد
کہ ہار تھک کے گھروں سے قیامتیں بھی گئیں



چُپکے چُپکے ہی اثر کرتا ہے
عِشق کینسر کی طرح بڑھتا ہے

رات کے پچھلے پہر تاروں میں
ایک ہنگامہ مچا رہتا ہے

گھر سے بھاگے ہُوئے بچّے کی طرح
دل سرِ شہرِ وفا تنہا ہے

خواب میں جس سے پریشان تھے ہم
آنکھ کھولی تو وہی نقشہ ہے

ق

کون سنتا ہے کسی کی بپتا
سب کے ہاتھوں پہ یہی قصّہ ہے

کوئی ڈرتا ہے بھری محفل میں
کوئی تنہائی میں ہنس پڑتا ہے

یہی جنّت ہے یہی ہے دوزخ
اور دیکھو تو یہی دُنیا ہے

سب کی قسمت میں فنا ہے جب تک
آسمانوں پہ کوئی زندہ ہے

وہ خدا ہے تو زمیں پر آئے
حشر کا دن تو یہاں برپا ہے

سانس روکے ہُوئے بیٹھو امجد
وقت دُشمن کی طرح چلتا ہے

۱۹۷۴ء



نہ آسماں سے نہ دُشمن کے زور و زر سے ہُوا
یہ معجزہ تو مرے دستِ بے ہُنر سے ہُوا

قدم اُٹھا ہے تو پاؤں تلے زمیں ہی نہیں
سفر کا رنج ہمیں خواہشِ سفر سے ہُوا

میں بھیگ بھیگ گیا آرزو کی بارش میں
وہ عکس عکس میں تقسیم چشمِ تر سے ہُوا

سیاہی شب کی نہ چہروں پہ آ گئی ہو کہیں
سحر کا خوف ہمیں آئنوں کے ڈر سے ہُوا

کوئی چلے تو زمیں ساتھ ساتھ چلتی ہے
یہ راز ہم پہ عیاں گردِ رہگزر سے ہُوا

ترے بدن کی مہک ہی نہ تھی تو کیا رُکتے
گزُر ہمارا کئی بار یُوں تو گھر سے ہُوا

کہاں پہ سُوئے تھے امجد کہاں کھُلیں آنکھیں
گماں قفس کا ہمیں اپنے بام و دَر سے ہُوا

۱۹۷۴ء



جو دوست ہی نہ رہا، اُس سے اب گِلہ کیا ہے!
مرے خُدا! یہ محبّت کا سِلسلہ کیا ہے!

چلو تو سیل کی صُورت نظر جُھکا کے چلو
بلند و پست جو دیکھے وہ حوصلہ کیا ہے!

صدائے نکہتِ غنچہ! کہیں قیام تو کر
پتہ چلے تو سہی کچھُ معاملہ کیا ہے!

کرن کرن اُسے ڈھونڈا، صَدف صَدف دیکھا
اگر ہے سعیِ مُسلسل کا کچھ صِلہ، کیا ہے؟

وہ شخص جا بھی چُکا ہے، بہار ہو بھی چُکی
مگر یہ پھُول سرِ شاخِ دِل، کِھلا کیا ہے!

۱۹۷۴ء



سانسوں میں اشتعال سا آیا ہُوا تو ہے
موسم شبِ وصال سا آیا ہُوا تو ہے
بیٹھے بٹھائے سُرخ ہُوئے کان کِس لیے!
دل میں کوئی خیال سا آیا ہُوا تو ہے
لکھتے ہیں آستینِ ہوا پر کہانیاں
ہاتھوں میں یہ کمال سا آیا ہُوا تو ہے
کاخِ بلند بام کو شاید خبر نہیں
بُنیاد میں زوال سا آیا ہُوا تو ہے

ڈرتا ہوں آسمان کا جادو نہ ٹوٹ جائے
لب تک کوئی سوال سا آیا ہُوا تو ہے
امجد جُدائیوں کی یہ تمہید تو نہیں
لہجوں میں پھر ملال سا آیا ہُوا تو ہے



نکل کے حلقۂ شام و سحر سے جائیں کہیں
زمیں کے ساتھ نہ مل جائیں یہ خلائیں کہیں!

سفر کی رات ہے پچھلی کہانیاں نہ کہو!
رُتوں کے ساتھ پلٹتی ہیں کب ہوائیں کہیں!

فضا میں تیرتے رہتے ہیں نقش سے کیا کیا!
مجھے تلاش نہ کرتی ہوں یہ بلائیں کہیں!

ہَوا ہے تیز، چراغِ وفا کا ذِکر تو کیا
طنابیں خیمۂ جاں کی نہ ٹوٹ جائیں کہیں!

میں اوس بن کے گُل حرف پر چمکتا ہُوں
نکلنے والا ہے سُورج، مجھے چھپائیں کہیں!

مرے وُجود پہ اُتری ہیں لفظ کی صُورت
بھٹک رہی تھیں خلاؤں میں یہ صدائیں کہیں

ہَوا کا لمس ہے پاؤں میں بیڑیوں کی طرح
شفق کی آنچ سے آنکھیں پگھل نہ جائیں کہیں!

رُکا ہُوا ہے ستاروں کا کارواں امجد
چراغ اپنے لہُو سے ہی اَب جلائیں کہیں

۱۹۷۳ء

○

بام و دَر سے ہی بات کی جائے
رائیگاں کیوں یہ رات کی جائے!

پیاس پھر بستیوں میں اُتری ہے
گفتگوئے فُرات کی جائے

پتّھروں سے خطاب کیا کیجے
آدمی ہوں تو بات کی جائے

یا تو ترتیب دیں ستاروں کو
ختم یا کائنات کی جائے

آسماں دھم سے آ گرے نیچے
خاک اگر بے صفات کی جائے

صبح کی آس ہے نہ شام کا غم
جیسے زنداں میں رات کی جائے

توڑ دیں جال چاند تاروں کا
کوئی شکلِ نجات کی جائے

دسترس کے حصار سے آگے
سیرِ ناممکنات کی جائے

خاک کو خاک ہی میں ملنا ہے
کیوں خلاؤں کی بات کی جائے

مٹھیاں کھل رہی ہیں غنچوں کی
کچھ سبیلِ ثبات کی جائے

خاک کا سحر ٹوٹتا ہو جب
کیا بھری کائنات کی جائے!

۱۹۷۳



آنکھوں میں باز دید کا ارمان رہ گیا
کیا چاند تھا کہ ہالۂ حرمان رہ گیا

خالی گھروں میں جس طرح آسیب سانس لے
دل میں کسی کا سایۂ پیمان رہ گیا

منظر جو دل پسند تھے، آگے نکل گئے
رستوں میں ایک دیدۂ حیران رہ گیا

آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے مسافر گزر گئے
چسپاں فصیلِ شہر پہ اعلان رہ گیا

زنجیرِ درد ٹوٹ گئی ہے پہ قید ہوں
ہاتھوں میں ایک حلقۂ پیمان رہ گیا

ساحل کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا چاند
پہنچا جو پانیوں میں تو حیران رہ گیا

آئی بہار، باغ کی مٹی ہری ہوئی
امجد مگر وہ پیڑ کہ ویران رہ گیا

۱۹۷۳ء



مَیں بے نَوا ہُوں، صاحبِ عزّت بنا مجھے
اے ارضِ پاک، اپنی جبیں پر سجا مجھے

جس پر رقم ہیں نقشِ کفِ پائے رفتگاں
اے عہدِ ناتمام، وہ رستہ دِکھا مجھے

میں حَرف حَرف لوحِ زمانہ پہ دَرج ہُوں
مَیں کیا ہُوں! میرے ہونے کا مطلب سکھا مجھے

یا مُجھ کو اپنا چہرۂ منزل نما دِکھا
یا قیدِ صبح و شام سے کر دے رِہا مجھے

میں موجِ شوقِ خام تھا لیکن ترے طفیل
دریا بھی اپنے سامنے قطرہ لگا مجھے

۱۹۷۲ء



ہر شخص کی خُوں رنگ قبا ہے کہ نہیں ہے!
یہ قتل گہہِ اہلِ وفا ہے کہ نہیں ہے!

محرومِ جواب آتی ہے فریاد فلک سے
ان ظُلم نصیبوں کا خُدا ہے کہ نہیں ہے!

اے قریۂ بے خوابِ تمنّا کے مکینو
اس راہ کا اُس کو بھی پتا ہے کہ نہیں ہے!

اِک ریت کا دریا سا اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
صحرائے محبّت کا سِرا ہے کہ نہیں ہے!

آنکھوں کے لیے خواب ہیں شبنم کے لیے پھول
ہر چیز یہاں رشتہ بپا ہے کہ نہیں ہے!

اک نسل کی تعزیر سہیں دوسری نسلیں
اے منصفِ برحق، یہ ہُوا ہے کہ نہیں ہے!

بے رنگ ہُوئے جلتے ہیں آنکھوں کے جزیرے
طوفان کی یہ آب و ہوا ہے کہ نہیں ہے!

امجد جو رُکا اُس کی صدا پر نہ چلا پھر
انسان کا دل کوہِ ندا ہے کہ نہیں ہے!

۱۹۷۲ء



یہ دشتِ ہجر، یہ وحشت، یہ شام کے سائے
خُدا یہ وقت تری آنکھ کو نہ دکھلائے!

اُسی کے نام سے لفظوں میں چاند اُترے ہیں
وہ ایک شخص کہ دیکھوں تو آنکھ بھر آئے

جو کھو چکے ہیں اُنھیں ڈھونڈنا تو ممکن ہے
جو جا چکے ہیں اُنھیں کوئی کس طرح لائے!

کلی سے میں نے گُلِ تر جسے بنایا تھا
رُتیں بدلتی ہیں کیسے، مجھے ہی سمجھائے

جو بے چراغ گھروں کو چراغ دیتا ہے
اُسے کہو کہ مرے شہر کی طرف آئے

یہ اضطرابِ مسلسل عذاب ہے امجد
مرا نہیں تو کسی اور ہی کا ہو جائے!

۱۹۷۲ء

چاند کے ساتھ کئی درد پرانے نکلے
کتنے غم تھے جو ترے غم کے بہانے نکلے

فصلِ گُل آئی، پھر اک بار اسیرانِ وفا
اپنے ہی خُون کے دریا میں نہانے نکلے

ہجر کی چوٹ عجب سنگ شکن ہوتی ہے
دل کی بے فیض زمینوں سے خزانے نکلے

عُمر گُزری ہے شبِ تار میں آنکھیں مَلتے
کس اُفق سے مرا خورشید نہ جانے نکلے!



کُوئے قاتل میں چلے جیسے شہیدوں کا جلوس
خواب یوں بھیگتی آنکھوں کو سجانے نکلے

دِل نے اِک اینٹ سے تعمیر کیا تاج محل
تُو نے اِک بات کہی، لاکھ فسانے نکلے

دشتِ تنہائیِ ہجراں میں کھڑا سوچتا ہوں
ہائے کیا لوگ مرا ساتھ نبھانے نکلے

میں نے امجدؔ اسے بے واسطہ دیکھا ہی نہیں
وہ تو خُوشبُو میں بھی آہٹ کے بہانے نکلے

۱۹۷۲ء



ترکِ اُلفت کا بہانہ چاہے
وہ مُجھے چھوڑ کے جانا چاہے

اُس کی خوابِ خیالی دیکھو
آگ پانی میں لگانا چاہے

کچھ نہیں اور تغافل ہی سہی
آرزو کوئی ٹھکانہ چاہے

وقت دیوار بنا بیٹھا ہے
وہ اگر لوٹ بھی آنا چاہے



کوئی آہٹ تھی نہ سایا تھا
دل تو رُکنے کا بہانہ چاہے

میں وہ رستے کی سرائے ہُوں جسے
ہر کوئی چھوڑ کے جانا چاہے

دیکھنا دِل کی اذیت طلبی
پھر اُسی شہر کو جانا چاہے

۱۹۷۰ء



خزاں کے پھول کی صورت بکھر گیا کوئی
تجھے خبر نہ ہوئی اور مر گیا کوئی

دروں دریچوں میں خلقت دکھائی دیتی ہے
نواحِ سنگ میں آشفتہ سر گیا کوئی

ہوا نہ تھا پہ ہواؤں سا بے خبر تھا وہ
مجھے بٹھا کے سرِ رہ گزر، گیا کوئی

گریز میں وہ توجہ کا رنگ کیسا تھا!
اِس اِک سوال سے دامن کو بھر گیا کوئی

اسے گماں ہی نہ تھا جیسے میرے ہونے کا
مرے قریب سے یوں بے خبر گیا کوئی

غمِ حیات کے رستے عجیب تھے امجدؔ
کس نے رُک کے نہ دیکھا، کدھر گیا کوئی

۱۹۷۰ء





یہی بہت ہے کہ دل اس کو ڈھونڈ لایا ہے
کسی کے ساتھ سہی، وہ نظر تو آیا ہے

کروں شکایتیں، تکتا رہوں کہ پیار کروں!
گئی بہار کی صورت وہ لوٹ آیا ہے

وہ سامنے تھا مگر یہ یقین نہ آتا تھا
وہ آپ ہے کہ مری خواہشوں کا سایا ہے!

عذاب دھوپ کے کیسے ہیں، بارشیں کیا ہیں!
فصیلِ جسم گری جب تو ہوش آیا ہے

میں کیا کروں گا اگر وہ نہ مل سکا امجدؔ
ابھی ابھی مرے دل میں خیال آیا ہے

۱۹۷۰ء



پھُول کو رنگ ستارے کو ضیا کِس نے دی!
اے غمِ دل! ترے ہونٹوں کو نوا کِس نے دی!

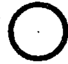
جی اُسے دیکھ کے کیوں آج بھر آتا ہے
شعلۂ عرضِ تمنّا کو ہَوا کِس نے دی!

دِل کے دریا میں گیا جو بھی، وہیں ڈُوب گیا
یہ مگر دھیان کی گلیوں سے صَدا کِس نے دی!

اپنی ہی شکل ہے، جس سمت نظر پڑتی ہے
شہرِ آئینہ میں آنکھوں کو سزا کِس نے دی!

ہُو بہُو اُس کی ہی آواز لگی ہے! دیکھو
وادیٔ سنگ میں امجد یہ نِدا کِس نے دی!

۱۹۷۰ء



اوروں کا تھا بیان تو موجِ صدا رہے
خُود عُمر بھر اسیرِ لبِ مُدّعا رہے

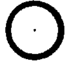
مثلِ حباب بحرِ غمِ حادثات میں
ہم زیرِ بارِ منّتِ آب و ہَوا رہے

میں اُس سے اپنی بات کا مانگوں اگر جواب
لہروں کا پیچ و خم وہ کھڑا دیکھتا رہے

ق

گُلشن میں تھے تو رونقِ رنگِ چمن بنے
جنگل میں ہم امانتِ بادِ صبا رہے
سُرخی بنے تو خُونِ شہیداں کا رنگ تھے
روشن ہُوئے تو مشعلِ راہِ وفا رہے
اُبھرے تو ہر بھنور کا جگر چاک کر گئے
ٹھہرے تو موج موج کو اپنا بنا رہے

امجدؔ درِ نگار پہ دستک ہی دیجیے
اس بے کراں سکوت میں کچھ غلغلہ رہے



گفتگو میں یک بیک تبدیلیٔ آواز کیا!
خامشی میری ہے میرے دَرد کی غماز کیا؟
دشت میں سیلاب ہے اور شہر ہیں تشنہ دہن
دوستو، دیدہ ورو، اس بات میں ہے راز کیا؟
آدمی کیا، اَب تو چلتے ہیں در و دیوار بھی
بھا گیا شہروں کو تیری چال کا انداز کیا؟
اِس جہانِ کور و کر میں خاک ہے عرضِ ہُنر
کیا دلِ اُلفت چشیدہ، رنگ کیا، آواز کیا؟
یہ زمینیں بے ثمر ہیں، راستے بے نُور ہیں
کیا ہوائے موسمِ گل اور چشمِ باز کیا؟
جس طرف چاہو، چلو امجدؔ ہوائے شوق میں
کاروانِ بے جہت کے واسطے آغاز کیا!

۱۹۶۹ء



عشاق نہ پتھر نہ گدا کوئی نہیں ہے
اب شہر میں سایوں کے سوا کوئی نہیں ہے

بچھڑے ہُوئے لوگوں کا پتہ کون بتائے
رستوں میں بجز بادِ بلا کوئی نہیں ہے

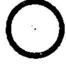
میں اپنی محبت میں گرفتار ہُوا ہُوں
اِس دُرد کی قسمت میں دَوا کوئی نہیں ہے

بے بار چلا اب کے برس موسمِ گُل بھی
اُس پھول کے کھلنے کی اَدا کوئی نہیں ہے

ہر آنکھ میں افسوس نے جالے سے تنے ہیں
ماحول کے جادُو سے رہا کوئی نہیں ہے

امجد یہ مرا دل ہے کہ صحرائے بلا ہے
مدت سے یہاں آیا گیا کوئی نہیں ہے

۱۹۶۹ء



ہم ہی آغازِ محبت میں تھے اَنجان بہت
ورنہ نکلے تھے ترے وصل کے عُنوان بہت

آئنہ خانۂ حیرت ہے کہ آسیب ہے وہ
آنکھ میں رہ کے بھی کرتا ہے پریشان بہت

دل بھی کیا چیز ہے اب پا کے اُسے سوچتا ہے
کیا اِسی واسطے چھانے تھے بیابان بہت

اے غمِ عشق، مری آنکھ کو پتھر کر دے
ہیں مرے سر پہ ترے اور بھی احسان بہت

فاصلے راہِ تعلق کے مٹیں گے کیوں کر
حسن پابندِ اَنا، عشق تن آسان بہت

اس کو بھی لگ ہی گئی شہرِ محبت کی ہَوا
وہ بھی امجد ہے کئی دن سے پریشان بہت



خواب نگر ہے آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہُوں
اُس کو اپنی جانب آتے دیکھ رہا ہُوں

کس کی آہٹ قریہ قریہ پھیل رہی ہے
دیواروں کے رنگ بدلتے دیکھ رہا ہُوں

کون مرے جادو سے بچ کر جاسکتا ہے!
آئینہ ہُوں، سب کے چہرے دیکھ رہا ہُوں

دروازے پر تیز ہَواؤں کا پہرا ہے
گھر کے اندر چُپ کے سائے دیکھ رہا ہُوں

جیسے میرا چہرہ میرے دُشمن کا ہو
آئینے میں خُود کو ایسے دیکھ رہا ہُوں

منظر منظر ویرانی نے جال تنے ہیں
گلشن گلشن بکھرے پتّے دیکھ رہا ہُوں

منزل منزل ہَول میں ڈُوبی آوازیں ہیں
رستہ رستہ خوف کے پہرے دیکھ رہا ہُوں

شہرِ سنگدلاں میں امجد ہر رستے پر
آوازوں کے پتھر چلتے دیکھ رہا ہُوں

۱۹۶۹ء





(نذرِ غالب)



دیکھتا رہتا ہوں میں جو کچھ پریشانی کرے
فیصلے جب دل کے ہوں تو کیا ہُنردانی کرے!

آنکھ میں منظر کا جالا، کان میں گردِ صدا
دشت کا ماحول پیدا خانہ ویرانی کرے

آرزو خود اپنے خوں سے انجمن پرداز ہے
دل بہر قیمت فروغِ جلوہ سامانی کرے

ایک تو اس کی نگاہوں نے کیا بے دست و پا
اس پہ یہ مشکل کہ اپنا دل بھی من مانی کرے

سامنے آیا ہے تو میرے رگ و پے میں اُتر
میں تو آئینہ نہیں جو صرف حیرانی کرے

کیا کہوں امجد ہوائے اضطرابِ دید کو
دشتِ دل کو ایک پل میں شبنمستانی کرے



ہر قدم گریزاں تھا، ہر نظر میں وحشت تھی
مصلحت پرستوں کی رہبری قیامت تھی

منزلِ تمنا تک کون ساتھ دیتا ہے!
گردِ سعیِ لاحاصل ہر سفر کی قسمت تھی

آپ ہی بگڑتا تھا، آپ من بھی جاتا تھا
اس گریز پہلو کی یہ عجیب عادت تھی

اُس نے حال پوچھا تو یاد ہی نہ آتا تھا
کس کو کس سے شکوہ تھا، کس سے کیا شکایت تھی!

دشت میں ہواؤں کی بے رُخی نے مارا ہے
شہر میں زمانے کی پُوچھ کچھ سے وحشت تھی

*

یُوں تو دن دہاڑے بھی لوگ لُوٹ لیتے ہیں
لیکن اُن نگاہوں کی اور ہی سیاست تھی

ہجر کا زمانہ بھی کیا غضب زمانہ تھا
آنکھ میں سمندر تھا، دھیان میں وہ صُورت تھی

۱۹۶۹ء





کون سی منزل پہ لے آئی اکائی ذات کی
ٹوٹ جاؤں گا اگر میں نے کسی سے بات کی

ٹوٹتی کلیوں کے ماتم میں ہَوا روتی رہی
پھول کے چہرے پہ لکھی ہے کہانی رات کی

ڈس گئیں میرے بدن کو رینگتی تنہائیاں
کھا گئیں اِس کو بلائیں گردشِ حالات کی

بند ہے آنکھوں میں منظر اس کے جاتے وقت کا
نقش ہے تصویر دل پر کپکپاتے ہاتھ کی

خامشی گویا ہُوئی، منظر زبانیں بن گئے
کب مجھے کچھ ہوش تھا کب اُس نے کوئی بات کی!

۱۹۶۸ء



دامِ خوشبو میں گرفتارِ صبا ہے کب سے
لفظ اظہار کی اُلجھن میں پڑا ہے کب سے

اے کڑی چُپ کے در و بام سجانے والے!
منتظر کوئی سرِ کوہِ ندا ہے کب سے

چاند بھی میری طرح حُسن شناسا نکلا
اُس کی دیوار پہ حیران کھڑا کب سے

بات کرتا ہُوں تو لفظوں سے مہک آتی ہے
کوئی انفاس کے پردے میں چھپا ہے کب سے

شعبدہ بازیٔ آئینۂ احساس نہ پُوچھ
حیرتِ چشم وہی شوخ قبا ہے کب سے

دیکھیے خُون کی برسات کہاں ہوتی ہے!
شہر پر چھائی ہُوئی سُرخ گھٹا ہے کب سے

کور چشموں کے لیے آئینہ خانہ معلوم!
ورنہ ہر ذرّہ ترا عکس نما ہے کب سے

کھوج میں کس کی بھرا شہر لگا ہے امجد
ڈھونڈتی کس کو سرِ دشت ہَوا ہے کب سے!

۱۹۶۸ء

رات میں اس کشمکش میں ایک پل سویا نہیں
کل میں جب جانے لگا تو اُس نے کیوں روکا نہیں

یوں اگر سوچوں تو اِک نقش ہے سینے پہ نقش
ہائے وہ چہرہ کہ پھر بھی آنکھ میں بنتا نہیں

کیوں اُڑاتی پھر رہی ہے در بدر مجھ کو ہوا
میں اگر اِک شاخ سے ٹوٹا ہُوا پتّا نہیں!

درد کا رستہ ہے یا ہے ساعتِ روزِ حساب
سینکڑوں لوگوں کو روکا ایک بھی ٹھہرا نہیں

شبنمی آنکھوں کے جگنو، کانپتے ہونٹوں کے پھول
ایک لمحہ تھا جو امجد آج تک گزرا نہیں

۱۹۶۶ء



بند تھا دروازہ بھی اور گھر میں بھی تنہا تھا میں
تُو نے کچھ مجھ سے کہا یا آپ ہی بولا تھا میں؟

یاد ہے اب تک مجھے وہ بدحواسی کا سماں
تیرے پہلے خط کو گھنٹوں چُومتا رہتا تھا میں

میری اُنگلی پر ہیں اب تک میرے دانتوں کے نشاں
خواب ہی لگتا ہے پھر بھی جس جگہ بیٹھا تھا میں

راستوں میں تیرگی کی یہ فراوانی نہ تھی
اس سے پہلے بھی تمہارے شہر میں آیا تھا میں

آج امجد خواب ہے میرے لیے جس کا خیال
کل اُسی کا ہاتھ تھامے گھومتا پھرتا تھا میں





سکوں محال ہے امجدؔ وفا کے رستے میں
کبھی چراغ جلے ہیں ہوا کے رستے میں؟

نجانے اب کے برس کھیتیوں پہ کیا گزرے!
کئی پہاڑ کھڑے ہیں گھٹا کے رستے میں

قدم قدم پہ قدم لڑکھڑائے جاتے ہیں
بتوں کے ڈھیر لگے ہیں خدا کے رستے میں

جہانِ نو کو شعورِ مسافرت دیں گے
ہم اپنے خون سے شمعیں جلا کے رستے میں

دیارِ اہلِ محبت میں کس نے دی آواز
ہزار ساز بجے ہیں صدا کے رستے میں

سوائے دردِ محبت، بجز غبارِ سفر
کوئی رفیق نہ پایا وفا کے رستے میں

۱۹۶۶ء



میں ازل کی شاخ سے ٹوٹا ہوا
پھر رہا ہوں آج تک بھٹکا ہوا

دیکھتا رہتا ہے مجھ کو رات دن
کوئی اپنے تخت پر بیٹھا ہوا

چاند تارے دور پیچھے رہ گئے
میں کہاں پر آ گیا اڑتا ہوا

بند کھڑکی سے ہوا آتی رہی
ایک شیشہ تھا کہیں ٹوٹا ہوا

کھڑکیوں میں، کاغذوں میں، میز پر
سارے کمرے میں ہے وہ پھیلا ہُوا

اپنے ماضی کا سمندر چھانیے
اِک خزانہ ہے یہاں ڈوبا ہُوا

دوستوں نے کچھ سبق ایسے دیئے
اپنے سائے سے بھی ہُوں سہما ہُوا

کِس کی آہٹ آتے آتے رُک گئی
کس نے میرا سانس ہے روکا ہُوا؟

۱۹۶۵ء